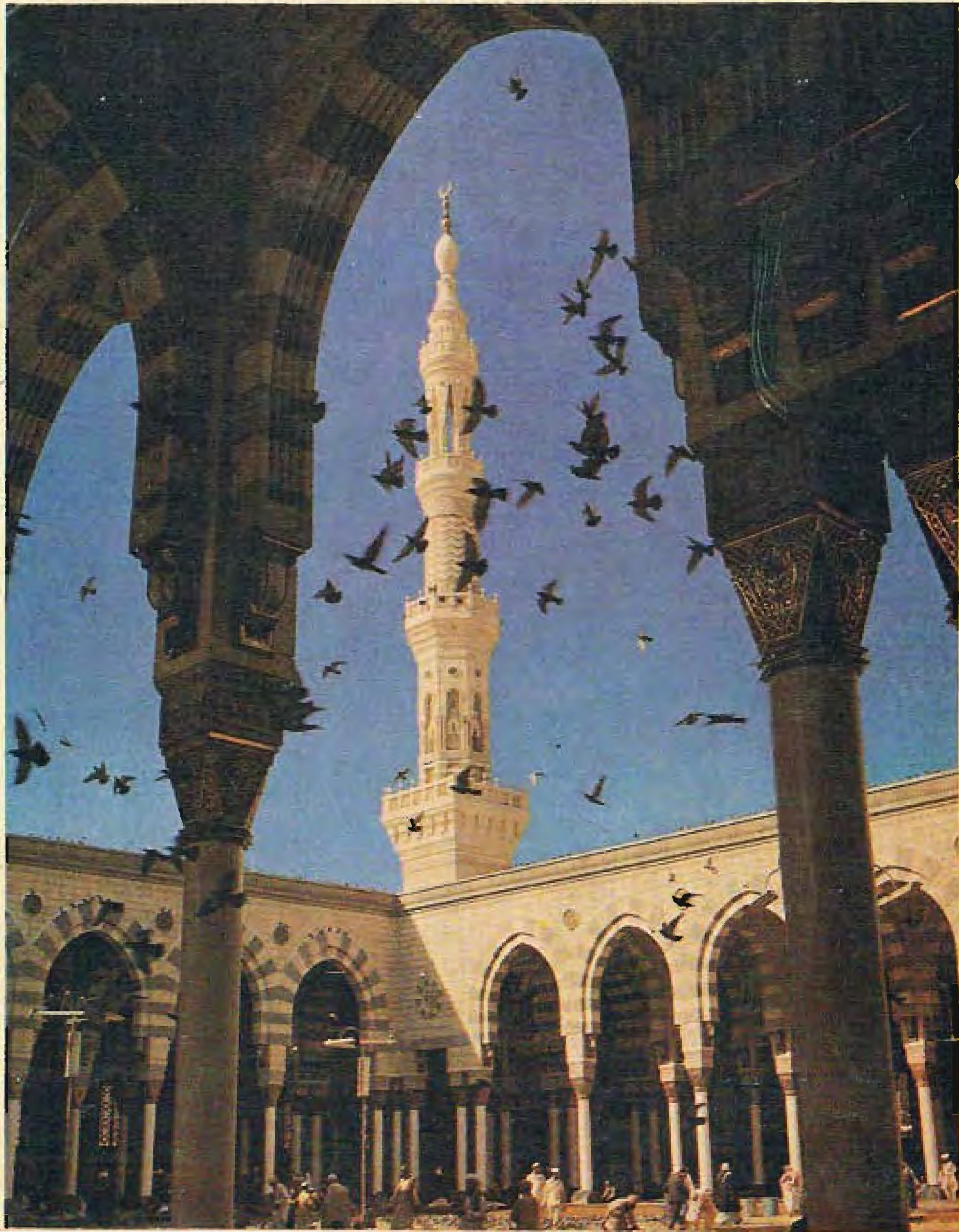
الرسالہ

Al-Risāla

May 1999 • No. 270 • Rs. 9

مقصد وہ ہے جو قابلِ حصول ہو۔ جو قابلِ حصول نہیں وہ مقصد بھی نہیں۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	30.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	40.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروانِ ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	25.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	85.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	4.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرھویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نثری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	45.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	40.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	8.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

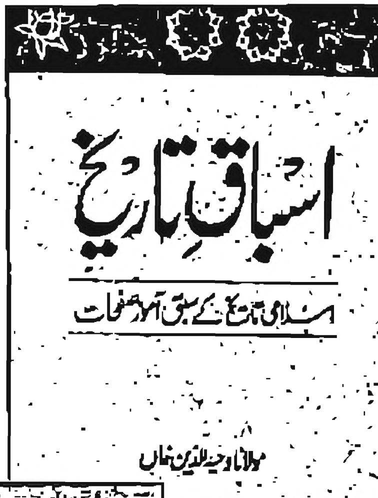
DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

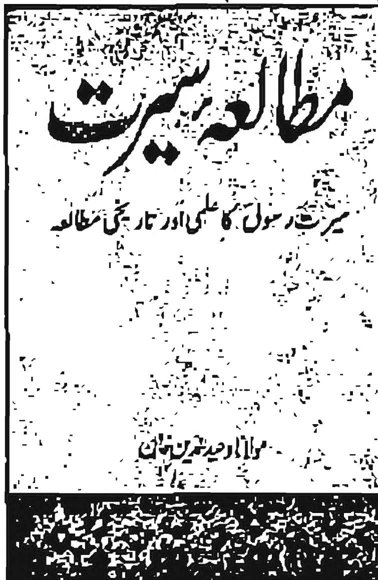
Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

مئی 1999 شمارہ 270

فہرست صفحہ

نئی کتابیں





جنتی کون

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے سچے بندوں کو اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے انھیں کرا دی ہے (یدخلھم الجنة عرفھا لھم) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل جنت کو جب جنت کے پھل دئے جائیں گے تو وہ کہیں گے۔ یہ تو وہی پھل ہے جو ہمیں دنیا میں دئے گئے تھے۔ (ھذا الذی رزقنا من قبل) (التوبہ ۲۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنتی کون ہے۔ جنتی انسان وہ ہے جس نے دنیا ہی میں آخرت کا تجربہ کیا۔ جس نے آخرت میں خدا کو براہ راست دیکھنے سے پہلے ابھی دنیا میں اس کو بالواسطہ طور پر دیکھا۔ جس نے اس بے پناہ شکر خداوندی کا دنیا ہی میں تجربہ کیا جو کسی آدمی کو اس وقت حاصل ہوگا جب کہ وہ اپنے آپ کو جنت کے لطیف و نفیس دنیا کے اندر پائے گا۔ جس کے لئے خدا کی دنیا میں عاید کی جانے والی خدائی ذمہ داریاں اس طرح پر لذت بن گئیں جس طرح کسی کو آخرت میں ملنے والا انعام پر لذت معلوم ہوگا۔ جس نے دنیا ہی میں ان حقیقتوں کو معرفت کے درجہ میں پالیا جن کو پانے والے آخرت میں واقعہ کے درجہ میں پائیں گے۔

جنتی انسان وہ ہے جس نے کائنات کی وسعتوں میں جنت کی وسعتوں کو دیکھا۔ جس نے چڑیوں کے چہچہے میں جنت کے نغموں کو سنا۔ پانی کی ٹھنڈک جس کے لئے خدا کی رحمت بن کر اس کی رگوں میں اتر گئی۔ جس کا سینہ ان کیفیات رحمت سے معمور ہو گیا جو جنت کے باشندوں کا خاصہ ہوگا۔

جنتی انسان وہ ہے جو دنیا میں اس مچھلی کی طرح رہا جس کو پانی سے نکال کر باہر ڈال دیا گیا ہو۔ جنتی انسان وہ ہے جو آخرت کی یاد میں اتنا زیادہ محو ہوا کہ دنیا کی لذتیں اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ جنتی انسان وہ ہے جو اس وقت بھی جنت میں تھا جب کہ ابھی وہ جنت سے باہر تھا، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے اس نے اپنے تصورات میں جنت کو پایا تھا اور بعد کو وہ اپنے حقیقی تجربہ میں جنت کا ایک خوش نصیب باشندہ ہوگا۔

غیر مسنون تحریکیں

مکہ کے عربی ہفت روزہ العالم الاسلامی (۲۹ شوال ۱۴۱۹ھ۔ 31 Feb. 1989) کے ساتھ چوبیس صفحات کا ایک فلسطینی ضمیمہ شامل ہے۔اس ضمیمہ کے آخری صفحے پر بیت المقدس کی ایک بڑی تصویر چھپی ہے۔اس کے اوپر جلی حرفوں میں یہ لکھا ہوا ہے: **متی... تعود القدس** (قدس کب واپس ہوگا)۔

موجودہ مسلمانوں کا لکھنے والا اور بولنے والا طبقہ قدس کے معاملے میں جس طرح سوچتا ہے، یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ان لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ قدس (قبلۂ اول) یہودیوں کے قبضہ میں ہے ایسی حالت میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس کو یہودیوں کے سیاسی قبضہ سے نکالا جائے اس کے بغیر وہاں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ قدس کو قبلۂ اول کا جذباتی نام دے کر اس کی واپسی کی خونی مہم چلا رہے ہیں، ان کو معلوم نہیں کہ ہجرت کے بعد جب پیغمبر اسلام نے قدس کو اپنا قبلہ بنایا تھا اس وقت بھی وہ اغیار کے سیاسی قبضہ میں تھا نہ کہ مسلمانوں کے قبضہ میں۔ ایسی حالت میں قبلۂ اول کے نام سے جو لوگ یہ تحریک چلا رہے ہیں اس کا کوئی تعلق نہ قبلۂ اول سے ہے اور نہ پیغمبر اسلام کی سنت سے۔

پیغمبرؐ اسلام اپنی نبوت کے ابتدائی تیرہ سال تک مکہ میں تھے۔ اس وقت کعبہ کی حالت مزید اضافے کے ساتھ عین وہی تھی جو اس وقت قدس کی بتائی جاتی ہے۔ اس وقت کعبہ کے اوپر مشرکین کا مکمل قبضہ تھا۔ اس کے باوجود پیغمبر اسلام نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ **"متی تعود الکعبہ"** (کعبہ کب واپس ہوگا) بلکہ اس کو اسی حالتپر باقی رکھتے ہوئے آپ روزانہ کعبہ میں جاتے، اور وہاں عبادت کرتے، اور مشرکین سے مل کر انھیں پر امن طور پر توحید کا پیغام دیتے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اسلام کے نام پر جو تحریکیں چلا رہے ہیں وہ کس قدر غیر اسلامی ہیں۔ انھوں نے دین کے ساتھ سیاسی اقتدار کو اس طرح

ناقابلِ تقسیم حد تک جوڑ رکھا ہے گویا کہ جب تک سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو کوئی دینی کام نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فکر پیغمبر اسلام کے طریقہ کے سراسر خلاف ہے۔ یہی غیر مسنون طریقہ ہے جس نے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی اسلامی تحریکوں کو ایک بے فائدہ ہنگامہ بنادیا۔ قربانی کی حد تک عمل کرنے کے باوجود ان تحریکوں کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

پیغمبرؐ اسلام کا طریقہ کیا تھا۔ مکی دور میں کعبہ پر مشرکین کا سیاسی قبضہ قائم تھا، اس کے باوجود آپ نے کعبہ کو مرکز عبادت اور مرکز دعوت کے طور پر استعمال کیا۔ معراج کے وقت بیت المقدس پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا اس کے باوجود آپ اللہ کے حکم سے وہاں گئے اور تمام نبیوں کے ساتھ اجتماعی نماز ادا کی۔ ہجرت کے بعد بیت المقدس پر عیسائیوں کا سیاسی قبضہ تھا، اس کے باوجود آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال تک بیت المقدس کو اپنا قبلۂ عبادت بنایا، وغیرہ

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ بروقت جو سیاسی حالت (political statusquo) قائم ہے اس کو سب سے پہلے توڑیں اور اس کے بعد اپنا دینی فریضہ ادا کریں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ موجود سیاسی اقتدار کے باقی رہتے ہوئے جو دینی یا دعوتی عمل کیا جاسکتا ہے، اس سے اپنا عمل شروع کردینا۔ سیاسی مسائل کو حالتِ التواء میں رکھ کر موجود مواقع کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔ یہی پیغمبر اسلام کی سنت ہے، اور اس دنیا میں کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہے جو پیغمبر اسلام کی سنت پر عمل کریں۔

مذکورہ قسم کا سیاسی فکر آدمی کو صرف محرومی اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتا ہے، وہ کسی کو مثبت عمل کا حوصلہ نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اگر سیاسی اقتدار کو چھیڑے بغیر ممکن دائرے میں اپنا کام شروع کردیا جائے تو آدمی کو فوراً ہی مثبت کام کے لئے کھلا ہوا میدان مل جائے گا۔ اب ہر آدمی امید اور حوصلے کے ساتھ اقدام کی پوزیشن میں ہو جائے گا۔ وہ رکاوٹ کی چٹان سے غیر ضروری ٹکراؤ کئے بغیر اپنے لئے تعمیری عمل کے مواقع پالے گا اب اس کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھنے کے ہم معنیٰ ہوگا۔

ہماچل پردیش کا سفر

مفتی عبد العزیز صاحب رائے پوری نے ستمبر ۱۹۷۹ میں مسروالا (ہماچل پردیش) میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے شیخ مولانا عبد القادر رائپوری کے نام پر اس کا نام مدرسہ قادریہ رکھا۔ اس کے بعد جلد ہی اپنے شاگرد مولانا کبیر الدین فاران مظاہری کو بلا کر اس کا انتظام ان کے حوالے کر دیا۔ ۱۹۸۰ سے مولانا کبیر الدین صاحب اس کے ناظم ہیں۔

پچھلے دس سال سے وہ برابر مجھ کو اپنے مدرسہ میں آنے کی دعوت دے رہے تھے، کبھی براہِ راست اور کبھی ٹیلی فون پر۔ مگر کسی نہ کسی سبب سے وہاں کا سفر نہ ہو سکا۔ ۷ انومبر 1995 کی صبح کو وہ دہلی آئے اور کچھ اس انداز سے اصرار کیا کہ میرے لئے انکار نا ممکن ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا، میں ابھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ چنانچہ میں اپنے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر صبح ۱۰ بجے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

ہماری گاڑی چلتے ہوئے اس سڑک پر پہنچی جہاں ایک طرف تاریخی جامع مسجد ہے اور دوسری طرف لال قلعہ کی سرخ دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ لال قلعہ کو دیکھ کر مجھے اردو شاعر کی طویل نظم کا ایک شعر یاد آیا:

اے قلعۂ سرخ اے اثرِ شاہجہانی   برباد شدہ عظمتِ ماضی کی نشانی

یہ شعر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ ماضی کی گزری ہوئی عظمتوں میں اتنا گم ہوئے کہ وہ حال کی حقیقتوں کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ پدرم سلطان بود کی نفسیات نے انہیں مثبت نقطۂ نظر سے محروم کر دیا۔ اس المناک صورت حال کا سبب یہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں جو لوگ مسلمانوں کے رہنما بن کر اٹھے وہ زیادہ تر شاعر اور خطیب اور انشاء پرداز قسم کے لوگ تھے انہوں نے رجز خوانی کی، جب کہ اس وقت اصل ضرورت حقیقت بیانی کی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اپنی غیر حقیقی باتوں سے پوری ملت کے مزاج کو بگاڑ دیا۔ موجودہ زمانہ میں

شاید کوئی بھی ایسا رہنما نہیں جس نے معاملات کو گہرائی کے ساتھ سمجھا ہو اور پھر حقیقت پسندانہ انداز میں مسلمانوں کو درست رہنمائی دی ہو۔

لال قلعہ اور قطب مینار کی حیثیت آج صرف آثار قدیمہ کی ہے جو گروہ لال قلعہ اور قطب مینار کی فضاؤں میں جیتا ہو وہ خود بھی آثار قدیمہ کی ایک مثال بن کر رہ جائے گا، وہ دور جدید میں باعزت مقام حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

دہلی سے نکل کر آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں طرف دور تک درخت اور سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ ساری کائنات کے مقابلہ میں زمین اس سے بھی زیادہ چھوٹی ہے جتنا کہ پوری زمین کے مقابلہ میں ایک ذرہ۔ مگر اب تک کی معلومات کے مطابق، زمین ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں پانی اور سبزہ ہے۔ ساری وسیع کائنات میں کہیں بھی پانی اور سبزہ موجود نہیں۔

اسی پانی اور سبزہ نے زمین کو انسان جیسی زندہ مخلوق کے لئے قابل رہائش بنادیا ہے۔ یہاں اس کے لئے نہ صرف رہائش کا سامان ہے بلکہ تمدنی ترقیوں کے لئے تمام ممکن اسباب بھی موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالی کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس کا شکر صرف یہ ہے کہ آدمی دل سے اس عطیہ کا اعتراف کرے اور اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کی تابعداری میں دے دے۔

یہ سفر مدرسہ کی کار سے ہوا۔ راستہ میں میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا کہ ۱۹۴۷ میں جب ملک تقسیم ہوا اس کے بعد ہندوستان میں کتنے ایسے مولوی تھے جن کے پاس کار اور ٹیلی فون تھے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولے کہ شاید ایک بھی نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ آج کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ آج تو ملک میں ہزاروں مولویوں کے پاس کار اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ایسے مولوی ہیں جن کو آج براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کار اور ٹیلی فون کی سہولت حاصل ہے۔

پھر میں نے کہا کہ مگر کوئی بھی مولوی ایسا نہیں جو تحریر یا تقریر کے ذریعہ یہ اعلان کرتا ہو کہ مسلمان اس ملک میں ترقی کر رہے ہیں، نہ اکابر میں اور نہ غیر اکابر میں، بلکہ یہی لوگ ہیں جو

اپنی تقریروں اور تحریروں میں روزانہ ہندستانی مسلمانوں کی بربادی کا چرچا کرتے ہیں۔ حتی کہ باہر کے ملکوں میں بھی جاکر وہ اسی قسم کی خبریں وہاں کے لوگوں کو سناتے ہیں۔ مثلاً مکہ کے اخبار "العالم الاسلامی" کے تازہ شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۹۵ میں ایک معروف ندوی عالم کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ انڈیا کے مسلمان مخالفانہ مؤامرات کا اور ہندوؤں کی عداوت کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے ـــــ انڈیا کے مسلمان چکی کے دو پاٹوں کے درمیان (مسلمو الهند بَیْن فکّی الرَّحی)

ـ انٹرویو لینے والا اگر سمجھدار ہوتا تو وہ ان سے پوچھتا کہ جب تمام ہندستانی مسلمان ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں تو تم کس طرح اتنے شاندار طور پر اس سے بچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم کو تو تم وہی تدبیر بتاؤ تاکہ ہم بشّرو ولا تنفروا کے اسلامی اصول پر ہندستان کے مسلمانوں کو اس کی خوشخبری دے سکیں۔

اپنے ملک کے پڑھے لکھے مسلمانوں کی سوچ کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک ماضی کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں کے لیڈروں نے سمجھایا کہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ اس لئے ہمیں علیحدہ ملک چاہئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تمام دماغ آج تک ماضی کے اسی بے بنیاد پروپیگنڈے میں گم ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی کے مسلم لیڈروں کی تقسیم کے مطابق، ہم "ہندو انڈیا" میں ہیں، اس لئے ہم ضرور تباہ حال ہوں گے۔ چنانچہ وہ ابھی تک وہی ماضی کی بولی بولے چلے جارہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آج ہندستان کے مسلمان پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ خود لکھنے اور بولنے والے طبقہ میں ایک ایک شخص اپنی ۱۹۴۷ کی حالت کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی حاصل کئے ہوئے ہے۔ مگر تخلیقی فکر کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے قریبی واقعہ تک کا علم نہیں۔

ماضی کے مسلم رہنماؤں کی سوچ قانون فطرت کے خلاف تھی۔ چنانچہ ان مسلم رہنماؤں

کی باتیں فضا میں گم ہو گئیں۔ اور فطرت کا قانون خود اپنی طاقت سے قائم ہو گیا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہیں صرف اپنے اکابر کی باتوں کا علم ہے، انہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے فطری قانون کا کوئی علم نہیں۔

دہلی سے مسر والا کا فاصلہ ڈھائی سو کیلو میٹر سے کچھ زیادہ ہے۔ سڑک اچھی ہے۔ راستہ میں سونی پت، پانی پت، کرنال، جمنا نگر وغیرہ پڑتے ہیں۔ ہم لوگ ایک کے بعد ایک ان مقامات سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ میں نے سوچا کہ ان جگہوں کے نام اسی طرح صدیوں سے چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کے قدیم باشندے آج پیدا ہوں تو ان جگہوں کی بدلی ہوئی صورت کی بنا پر شاید وہ انہیں پہچان نہ سکیں۔

سونی پت سے آگے بڑھے تو سڑک کے کنارے دو کاریں الٹی پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں بالکل چکنا چور ہو چکی تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھیں چنانچہ جب دونوں کار کا آمنا سامنا ہوا تو دونوں میں سے کوئی بھی اپنی گاڑی کو کنٹرول نہ کر سکا اور دونوں ہی ٹکرا کر تباہ ہو گئیں۔

میں نے کہا کہ گاڑی خواہ کتنی اچھی ہو، اور ڈرائیور خواہ کتنا ہی ماہر ہو۔ بہر حال اس کو سڑک پر چلتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ سڑک کے اوپر دوسری گاڑیاں بھی دوڑ رہی ہیں۔ اگر وہ اس حقیقت کا اعتراف نہ کرے تو کوئی بھی چیز اس کے کام نہیں آئے گی۔ وہ خود بھی تباہ ہو گا اور اسی کے ساتھ اس کی تیز دوڑتی ہوئی گاڑی بھی۔

ڈیڑھ بجے ہم لوگ کرنال پہونچے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد ہے جس کے اوپر ''مسجد صغرا'' لکھا ہوا ہے۔ اس میں جمعہ کی نماز پڑھی۔ مسجد بظاہر قدیم تھی۔ مگر مزید تعمیر کر کے اس کو اندر سے نیا کر دیا گیا ہے۔ پوری مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔

مجھے قرآن کی آیت یاد آئی کہ جمعہ کی نماز کی اذان ہو تو نماز کے لئے اکٹھا ہو جاؤ اور جب نماز ختم ہو تو خدا کی زمین میں منتشر ہو جاؤ۔ میں نے سوچا کہ مسجد منتشرین کا مقام اجتماع ہے۔

اہل ایمان خدا کی زمین میں پھیلنے والے لوگ ہیں۔ وہ صرف وقتی طور پر مسجد میں ٹھہرتے ہیں تاکہ اس سے نئی توانائی لے کر دوبارہ آگے بڑھ سکیں۔

کرنال میں سڑکوں پر بہت سی مسجدیں دکھائی دیں۔ ایک عمارت پیچھے سے مسجد کی شکل کی تھی۔ لیکن آگے سے اس کو گوردوارہ بنادیا گیا تھا۔

کرنال میں ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ اس کو اندر جا کر دیکھا۔ اس کے امام سید انور حسین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ امام صاحب نے چائے کے لئے اصرار کیا مگر ہمارے پاس وقت کم تھا اس لئے معذرت کرنی پڑی۔ مسجد کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس پر لکھا ہے ــــــ تعمیر کردہ نواب عظمت علی خاں، رئیس اعظم کرنال۔ وہ نواب زادہ لیاقت علی خاں کے چچا تھے۔ انہوں نے یہ مسجد ۱۹۲۵ میں بنوائی تھی۔

۱۹۴۷ میں کرنال مکمل طور پر مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب دوبارہ مسلمان آکر یہاں آباد ہو گئے ہیں۔ اس وقت کرنال میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے کرنال میں میور ریستوران میں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ایک صاحب آگے بڑھ کر مجھ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا اس لئے پہچان گیا۔ آپ کی بات مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ ان کا نام ایم آر کپور تھا۔ انہوں نے آٹوگراف کے لئے کہا۔ میں نے انگریزی کا ایک جملہ لکھ کر اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیئے۔ اس درمیان میں کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ ایک خاتون نے بھی آٹوگراف لیا۔

عصر کی نماز ہم نے جمنا نگر میں پڑھی۔ وہاں سڑک کے کنارے ایک مسجد تھی۔ اس میں چار پانچ زیادہ عمر کے اور سیدھے سادے مسلمان نظر آئے۔ ان سے پوچھا کہ جمنا نگر میں کتنی مسجدیں ہیں، کسی نے کہا ایک۔ کسی نے کہا تین۔ غرض کافی پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا کہ وہاں پانچ مسجدیں ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں یہ شکایت کی تھی کہ :

بازار میں ہیں لاکھوں، مسجد میں فقط جمّن

آج اگرچہ کمیت کے اعتبار سے مسجد کے نمازیوں کی آبادی کافی بڑھ گئی ہے مگر جہاں تک کیفیت کا تعلق ہے، اب بھی مسجد کی آبادی میں زیادہ تر ''جمن'' قسم کے لوگ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

کرنال کے ریستوران سے کھانا کھا کر ہم لوگ نکلے تو مولانا کبیر الدین صاحب پاس کی ایک دکان پر چلے گئے۔ وہاں انہوں نے پان خریدا جس کی قیمت دو روپیہ تھی۔ پان والا ایک نوجوان ہندو تھا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے پوچھا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ اس نے کہا کہ سہارن پور۔ پھر پان والے نے کہا، کیا آپ کبھی سہارن پور گئے ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ ہاں، میں نے وہاں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد اس نے پان کی قیمت نہیں لی۔ اس نوجوان کا نام ارُن تھا۔ وہ دکان سے آکر مجھ سے ملا۔

مذکورہ واقعہ احساس قربت کا کرشمہ تھا۔ سامنے کے آدمی کو اگر کسی طرح آپ قربت کا احساس دلادیں، خواہ وہ قربت بالکل معمولی نوعیت کی کیوں نہ ہو تو فوراً وہ آپ کا گردیدہ ہو جائے گا۔ دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان اجنبیت ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرابت اپنے آپ سارے معاملات کو درست کر دیتی ہے۔

ہم لوگ صبح ۱۰ بجے دہلی سے روانہ ہوئے تھے۔ شام کو عشاء کے قریب مسر والا پہنچے، اس سفر میں ہم کبھی آبادی کے درمیان سے گزرے اور کبھی خالی سڑک سے، کبھی ہمارا راستہ کھلے میدان سے طے ہوا اور کبھی ایسے راستہ سے جہاں دونوں طرف جنگل تھا۔

کبھی ہماری گاڑی نشیب پر چلی اور کبھی اس کو اونچائی کے اوپر چڑھنا پڑا۔ میں نے سوچا کہ اسی طرح پوری زندگی ایک سفر ہے جو آخرت پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ دنیا میں آدمی مختلف احوال سے گزرتے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آتی ہے اور وہ آخری طور پر اگلی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔

نماز عشاء کے بعد مدرسہ کے دفتر میں اساتذہ اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر مختلف باتیں

ہوئیں۔ایک صاحب نے کہا کہ کچھ لوگ آپ کے پیغام کے مخالف کیوں ہیں۔

میں نے کہا کہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص میرے پیغام کا مخالف نہیں۔ کیونکہ میرا پیغام وہی ہے جو خود فطرت کا قانون ہے۔اور فطرت کے قانون کو نظرانداز کرنا کسی کے لئے ممکن ہی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ میری تحریریں ۹۹ فیصد اسلام کے تعارف پر مبنی ہوتی ہیں۔کوئی بھی شخص ان کا مخالف نہیں۔ کیونکہ کہ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی۔اس میں میں نے صرف یہ کیا ہے کہ اسلام کی متفقہ تعلیمات کو جدید اسلوب میں پیش کیا ہے۔اس کا کوئی مخالف نہیں ہو سکتا۔

ایک فیصد وہ ہے جس کا تعلق برادران وطن سے ہے۔اس سلسلہ میں میرا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ برادران وطن کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اگر کبھی کسی کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو تو اس سے اعراض کریں تاکہ پرامن فضا باقی رہے۔اس پر بھی تمام کے تمام مسلمان عامل ہیں۔ آپ کسی بھی مسلمان کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس کا ذاتی معاملہ جن ہندوؤں سے ہے اس کے ساتھ وہ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ آپ پائیں گے کہ یہ عین وہی ہے جس کی طرف الرسالہ میں توجہ دلائی جارہی ہے۔ میں نے صرف یہ کیا ہے کہ میں لوگوں کے عمل کا اعلان کررہا ہوں۔

عشاء کی نماز مدرسہ قادریہ کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد بالکل جدید طرز کی ہے اور سادگی کے ساتھ خوبصورتی کا عمدہ نمونہ ہے۔اس کی خصوصیات کی تصویر کشی لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد طلبہ نے مصافحہ کیا۔ اکثر ایسے موقع پر لوگ بھیڑ کی صورت میں مصافحہ کرتے ہیں۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ طلبہ نے مسجد کی دیوار سے مل کر قطار بنالی اور ایک ایک طالب علم آگے بڑھ کر مصافحہ کرتا رہا۔اس طرح تقریباً دو سو طلبہ نے مصافحہ کیا۔

مدرسہ کے قریب سے ایک اہم سڑک گزرتی ہے۔ مگر اس سڑک کو مدرسہ سے جوڑنے

کے لئے درمیان میں پختہ راستہ نہیں تھا۔ ۱۹۸۴ میں مدرسہ میں ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ منتظمین نے ریاستی حکومت کے نام ایک درخواست بھیجی کہ ہمارے یہاں ایک بڑا مذہبی جلسہ ہونے والا ہے۔ لوگ دور دور سے اس میں شرکت کے لئے آئیں گے۔ مگر عام سڑک اور مدرسہ کے درمیان اچھا راستہ نہیں ہے۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے مدرسہ تک ایک پختہ سڑک بنادی گئی۔ میں نے چل کر دیکھا تو وہ ۲۸۰ قدم لمبی تھی۔

مدرسہ کے مہمان خانہ میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ اتفاق سے میرا ہاتھ ہلا اور چائے میری چادر پر گر گئی۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری نے فوراً میری چادر لے کر ایک طالب علم کو دیا کہ اسے لے جا کر ابھی دھودو۔ یہ رات کا وقت تھا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو چادر سوکھے گی نہیں۔ کل اس کو دھوپ میں ڈالنا ہوگا۔ پھر غالباً دوپہر تک وہ سوکھ کر مجھے ملے گی۔ میں اسی خیال میں تھا کہ ۲۰ منٹ کے بعد طالب علم نے صاف چادر لاکر میرے پاس رکھ دی۔ اتنی دیر میں وہ دھوئی گئی، سکھائی گئی اور پریس کر کے تہ کی گئی اور پھر میرے پاس واپس آگئی۔



اس کا راز یہ تھا کہ یہاں مدرسہ میں جدید طرز کی واشنگ مشین موجود ہے جو دھونے کے بعد فوراً سکھانے کا کام بھی کر دیتی ہے۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے مدرسہ کی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نصاب کے اعتبار سے یہ ایک "قدیم طرز" کا مدرسہ ہے۔ مگر نظام اور تعمیرات کے اعتبار سے وہ بالکل جدید اور اپٹوڈیٹ ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آپ نے تو اپنے مدرسہ کو ایک ماڈرن مدرسہ بنادیا۔

اسی طرح مدرسہ میں آٹا پیسنے کی مشین ہے۔ مدرسہ کی ضرورت کا آٹا خود اپنی مشین میں پیسا جاتا ہے، وغیرہ۔

ایک بار ایک مسلمان تاجر مدرسہ قادریہ میں آئے۔ انہوں نے طلبہ کو دیکھ کر کہا آپ کے طلبہ کے کپڑے صاف نہیں ہیں۔ پھر یہی تبصرہ انہوں نے تمام مدارس کے بارہ میں کیا۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ آپ لوگ تنقید تو کر رہے ہیں مگر آپ اس کا حل نہیں بتاتے۔ انہوں نے کہا کہ حل کیا ہے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ حل بہت سادہ ہے۔ آپ پیسہ دیجئے ہم واشنگ مشین منگاتے ہیں۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ہمارے مدرسہ کے بچے کتنے صاف ستھرے ہیں۔

مذکورہ تاجر کو یہ بات اثر کر گئی۔ وہ فوراً اس پر راضی ہوگئے۔ چنانچہ دہلی جاکر انہوں نے مدرسہ کے لئے گاڈریج کی واشنگ مشین بھجوادی جو اس وقت سب سے اچھی سمجھی جاتی تھی۔

یہ ایک صحت مند مثال ہے۔ مدرسہ والے باعزت انداز میں تعاون مانگیں اور اصحاب خیر بھی باعزت انداز میں اپنا مالی تعاون دیں تو دینی اداروں کا کام نہایت حسن وخوبی کے ساتھ چلنے لگے گا۔

عشاء کی نماز کے بعد مدرسہ کے دفتر میں نشست ہوئی۔ اساتذہ بھی آگئے۔ دیر تک ملّی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے مولانا کبیر الدین مظاہری سے کہا کہ آپ نے اپنے مدرسہ کو جدید انداز میں بنایا ہے۔ اب یہاں ایک اور روایت قائم کیجئے۔ میں نے کہا کہ باہر سے جب کوئی

شخص کسی مدرسہ میں آتا ہے تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گفتگو یک طرفہ انداز میں ہوتی ہے۔ یعنی آنے والا بولتا ہے، اور مدرسہ کے لوگ صرف سامع بنے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں تبادلۂ خیال کے انداز میں گفتگو ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں یہ روایت پہلے سے قائم ہے۔ چنانچہ اسی انداز میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

مدرسہ کا دفتر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ بالکل جدید طرز کا ایک دفتر تھا۔ ایک خوبصورت میز کے گرد خوبصورت کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز پر کیلکولیٹر، ٹیلی فون، اور دوسری جدید نوعیت کی دفتری چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مولانا کبیر الدین مظاہری برابر ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر کے لوگوں کو میری آمد کی اطلاع دیتے رہے اور پروگرام مرتب کرتے رہے۔ کیونکہ میں اچانک یہاں آیا تھا، اور اب ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پروگرام کو منظم کیا جا سکتا تھا۔

ہماچل پردیش کا علاقہ ۱۹۴۷ میں مکمل طور پر فرقہ پرستی کی زد میں تھا جو ملک کی تقسیم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ مدرسہ قادریہ کے ساتھ بھی بار بار یہاں اشتعال انگیزی اور فساد کے مسائل پیدا ہوئے۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب نے حکمت اور تحمل کے ذریعہ ہر موقع پر کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے چنگاری کو ہوا دینے کے بجائے اس کو پہلے مرحلہ ہی میں بجھا دیا۔

یہاں کی کئی چیزیں دوسرے مدارس کے لئے قابل تقلید ہیں۔ مثلاً یہاں کا اصول ہے کہ دو استاد اگر آپس میں جھگڑیں تو دونوں ہی کو باعزت طور پر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں ایسا ہے کہ دو استادوں کے درمیان اگر نزاع پیدا ہو تو وہ آپ ہی آپ اس کو ختم کر لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مسئلہ نظامت تک پہنچا تو دونوں کو علیحدہ کر دیا جائیگا۔

طلبہ کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اساتذہ کی ذاتی خدمت کریں۔ مثلاً کوئی طالب علم کسی استاذ کا سر اور پاؤں نہیں دبا سکتا اور نہ ہی سر میں تیل لگا سکتا ہے۔ اسی قاعدہ کو برقرار رکھنے کے لئے یہاں جوان العمر اساتذہ رکھے گئے ہیں کیونکہ اس قسم کے رواج اکثر انہیں مدارس میں پائے جاتے ہیں جہاں بوڑھے اور زیادہ عمر کے اساتذہ ہوں۔ تاہم اسی کے ساتھ طلبہ کو یہ تاکیدی حکم ہے کہ وہ

ہر گز اپنے استاد کی نافرمانی نہ کریں۔

۱۸ نومبر کی صبح کو سواپانچ بجے مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ یہ لاؤڈاسپیکر کے بغیر تھی۔ یہاں چاروں طرف فطرت کا ماحول ہے۔ اس ماحول میں اذان کی دھیمی آواز بہت اثرانگیز تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے موذن نے فطرت کے دھیمے لہجہ میں ذکر خداوندی کا نغمہ بکھیر دیا ہو۔

فجر کی نماز میں امام صاحب نے سورہ جمعہ کی تلاوت کی۔ نماز کے بعد میں نے ایک صاحب سے کہا کہ دیکھئے قرآن میں ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کی تسبیح کر رہی ہیں (الجمعه ۱) مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ تسبیح سنائی نہیں دیتی۔ گویا فطرت کی زبان خاموشی کی زبان ہے۔ شور کی زبان فطرت کی زبان نہیں۔

مولانا کبیر الدین صاحب نے یہاں کی مسجد میں لاؤڈاسپیکر نہیں لگایا ہے۔ اس کا علاقہ پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ یہاں کے ہندو کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ کتنا اچھا مولانا ہے۔ وہ شور والا کام نہیں کرتا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنے دھرم کی سیوا کر رہا ہے۔

میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ آپ جو کر رہے ہیں وہ عین اسلامی طریقہ ہے۔ مسجدوں میں لاؤڈاسپیکر کا استعمال تو مجھے ایک بدعت معلوم ہوتا ہے۔ حدیث میں فتنہ کے زمانہ کی علامتوں میں سے ایک علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اس وقت مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی (رفعت الاصوات فی المساجد)۔

فجر کی نماز ختم ہوئی تو ایک بچہ نے کھڑے ہو کر مختلف اوقات کی دعائیں بلند آواز سے بتائیں۔ مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا پڑھیں، سونے کے وقت یہ دعا پڑھیں، وغیرہ۔

نماز کے بعد طالب علموں کے اٹھ کر جانے کا انداز بھی نہایت منظم تھا۔ طالب علم اچانک بھیڑ کی صورت میں نہیں اٹھے۔ میں نے دیکھا کہ لمبی صف کے دائیں طرف سے باری باری صرف ایک طالب علم اٹھتا اور خاموشی سے باہر چلا جاتا۔ اس طرح تمام طلبہ قطار بنا کر باہر نکلے۔ مسجد کے گیٹ کے باہر آتے ہی تمام طلبہ نے دوڑ لگانا شروع کی۔ دوڑ ایک استاد کی نگرانی

میں ہوئی۔

میں نے سوچا کہ یہ منظر اگر ٹی وی پر دکھادیا جائے تو لوگوں کو حقیقت معلوم ہو۔ کچھ غیر مسلم حضرات غلط طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسجد اور مدرسہ میں ہتھیاروں کی ٹریننگ ہوتی ہے۔ انہیں برعکس طور پر نظر آئے گا کہ مسجد میں آداب حیات سکھائے جاتے ہیں۔ یہاں طلبہ کو جسمانی ورزش کرائی جاتی ہے۔ یہاں ایک ایک طالب علم کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ شہری تقاضوں کو نبھائے۔ وہ ڈسپلن والی زندگی گزار سکے۔ وہ یہاں تربیت پاکر ایک اچھا انسان بن جائے۔

نماز اول وقت میں ہوئی۔ چنانچہ مسجد کے باہر ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا تھا۔ اب پروگرام کے مطابق تمام طلبہ سڑک پر پہنچے اور کچھ دیر تک دوڑ لگاتے رہے۔ یہ یہاں کا روزانہ کا معمول ہے۔ واپس آکر تمام طلبہ تلاوت قرآن میں مشغول ہوگئے۔

یہ مدرسہ ۳۶ بیگھہ زمین میں واقع ہے۔ وسیع رقبہ میں ایک شاندار اسلامی دنیا ابھر رہی ہے۔ مگر ایک صاحب کے الفاظ میں ''کبھی کوئی ہندو نہیں بولا۔ کبھی کوئی ہندو ڈنڈا لے کر نہیں آیا۔ اتنا بڑا کام نہایت پرسکون طور پر یہاں انجام پارہا ہے''۔ میں نے کہا کہ یہ سب حکمت کا نتیجہ ہے جس کو آپ لوگوں نے خدا کے فضل سے اختیار کیا ہے۔

ایک استاذ نے کہا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سیکولر لوگ سیاسی پلیٹ فارم پر آپس میں لڑتے ہیں اور پھر دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ مگر علماء کا یہ حال ہے کہ دو عالم اگر ایک بار کسی بات پر لڑ گئے تو دوبارہ وہ کبھی نہیں ملیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک عالم سے میں نے یہ بات کہی تو انہوں نے جواب دیا کہ سیکولر لوگ مکار ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسا کرتے ہیں۔ مگر علماء تو مخلص لوگ ہیں۔ جب میں اپنے کو حق پر سمجھوں تو میں کس طرح دوسرے سے مل سکتا ہوں۔

استاذ نے کہا کہ آپ کا یہ جواب درست نہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ دو مسلمانوں کے درمیان تین دن سے زیادہ ترک کلام اور ترک تعلق شریعت میں جائز نہیں۔ اس کا

مذکورہ عالم کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اپنے مخالف کو غلط ثابت کرنے کے لئے وہ اسلام کے اصولوں کا حوالہ دے رہے تھے، مگر خود اپنے اوپر اسلام کے اصول کو منطبق کرنے پر وہ راضی نہ ہوئے۔

مدرسہ سے ملحق ایک زمین تھی۔ اس پر عملاً مدرسہ کا قبضہ تھا۔ تاہم کاغذی اعتبار سے وہ کچھ ہندوؤں کی تھی۔ چونکہ نئے قانون کے مطابق قابض ہی مالک ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ زمین اب ہم کو نہیں ملے گی۔

ایک بار زمین کے مالکان یہاں آئے۔ انہوں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے کہا کہ یہ زمین جو آپ کے قبضہ میں ہے، اس کے اصل مالک ہم لوگ ہیں۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ اسلام میں قبضہ کوئی چیز نہیں۔ زمین کا جو مالک ہے وہی اس کا مالک رہے گا۔

مولانا کبیر الدین صاحب کی زبان سے یہ غیر متوقع بات سن کر وہ لوگ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس زمین کو بیچنا چاہتے ہیں۔ مگر آپ کو خریداری کا پہلا حق ہوگا۔ مزید یہ کہ انہوں نے مارکٹ ریٹ سے بہت کم قیمت میں اس زمین کو مدرسہ کے لئے دینا منظور کر لیا۔ حالانکہ مولانا کبیر الدین صاحب نے ان سے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہا تھا۔

بہت سے ہندی اخبار والے مدرسہ کو دیکھنے کے لئے آئے۔ انہوں نے اس کے بارہ میں اچھی رپورٹیں شائع کیں۔ ایک ہندی اخبار نے لکھا کہ یہ ہماچل پردیش کا شانتی نکیتن ہے۔

چنڈی گڑھ کے ہندی روزنامہ دینک ٹریبون (۱۳ اگست ۱۹۹۴) میں ایک رپورٹ مسلم مدارس کے بارے میں چھپی۔ اس کی سرخی تھی۔ ''بھارت کے مدرسوں میں ہو رہی ہے کٹر پنتھی کی پڑھائی'' اسی طرح پنجاب کیسری (۷ دسمبر ۱۹۹۴) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی:

''ہماچل میں چلائے جا رہے مدرسے شکچھا پرسار کے بجائے آتنک واد کا پرشکشن دے رہے ہیں''

اسی طرح انڈین اکسپریس کی چنڈی گڑھ اشاعت (۲۲ اگست ۱۹۹۴) میں رپورٹ چھپی جس کی سرخی یہ تھی: ISI bid to recruit HP youths via madrasas.

اس قسم کی خبروں کے ذریعہ اس علاقہ میں دینی مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ بڑھا۔ اس کا خاص نشانہ مسروالا کا مدرسہ قادریہ تھا۔ مگر یہ پروپیگنڈہ زحمت میں رحمت ثابت ہوا۔ پریس اور انتظامیہ دونوں تحقیق کے لئے متحرک ہوگئے۔ اور آخری رپورٹ عین مدرسہ کے حق میں نکلی۔ اس سلسلہ میں بہت سی موافق باتیں پریس میں آئیں جن سے فضا مزید اضافہ کے ساتھ مدارس کے حق میں ہوگئی۔ مثلاً جن ستا (۱۱جون) میں رپورٹ چھپی۔ اس کا عنوان تھا: بھائی چارہ کا پرتیک ہے مسروالا (کا مدرسہ)۔ حتیٰ کہ ہماچل کے چیف منسٹر راجہ ویر بھدر سنگھ نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس کی تردید کی۔ دینک ٹریبیون (۲۰ دسمبر) میں یہ رپورٹ اس سرخی کے ساتھ چھپی: "مدرسوں میں بھارت وِرودھی گتی ودھیاں نہیں"۔

اخبار والوں کی کئی پارٹیاں مدرسہ قادریہ میں آئیں۔ اور ہر چیز کو دیکھنے کے بعد اپنے اخباروں میں یہ رپورٹ چھاپی کہ ہم نے خود جاکر تحقیق کی اور تمام مخالفانہ پروپیگنڈوں کو غلط پایا۔ ان رپورٹوں کو پڑھنے کے بعد میں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ یہ آپ کے حق میں رفع ذکر کا معاملہ تھا۔ اور جب آدمی حق پر ہو تو ہر رفع ذکر عسر میں یسر کا سبب بن جاتا ہے۔

مدرسہ قادریہ مسروالا ہماچل پردیش ایک ایسے علاقہ میں واقع ہے جس کے اطراف میں غیر مسلموں کی بڑی آبادی ہے۔ مدرسہ والوں کے ان حضرات سے گہرے مراسم کی وجہ سے ان حضرات کی برابر یہاں آمد و رفت رہتی ہے، حتیٰ کہ خوشی اور غمی میں بھی وہ مدرسہ والوں کو شریک کرتے ہیں۔ اور اپنے نجی مسائل میں یہاں کے ذمہ داروں سے مشورہ کرتے ہیں۔ نیز یہاں آکر اسلام کی معلومات، اسلامی اخلاق اور مدرسہ کی حب الوطنی اور سیاست سے دوری اور علماء کی سادگی کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ایسے اسلامی ادارے ملک کے گوشہ گوشہ میں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ ادارے امن و محبت کا پیغام ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ غیر مسلم جن کو عام طور پر کٹر پنتھی کہا جاتا ہے وہ بھی یہاں کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان آنے والوں میں عام سرکاری ملازم سے لے کر وزیر اعلیٰ ہماچل پردیش جیسے افراد بھی شامل ہیں۔

افغانستان کے طالبان میں سے بعض افراد نے ایک انٹرویو کے دوران یہ کہا تھا کہ ہماری تعلیم دیوبند کے مدرسہ میں ہوئی ہے۔ اس کو ہندستان کے کچھ ہندی اخباروں میں اس طرح چھاپا گیا کہ طالبان نے جنگ جوئی کا سبق دیوبند کے مدرسہ میں رہ کر حاصل کیا ہے۔ اس کو مزید عام کر کے ہندی پریس میں یہ کہا گیا کہ ہندستان کے اسلامی ادارے اُگرواد اور علیحدگی پسندی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان مدرسوں کا بھارتیہ کرن کیا جائے۔ اس کے بغیر ہمارے ملک میں شانتی اور اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔

یہ بات بلاشبہ بالکل بے بنیاد ہے۔ میں خود مدرسہ ہی کا ایک پروڈکٹ ہوں اور جانتا ہوں کہ ان مدرسوں کا کوئی تعلق اُگرواد یا علیحدگی پسندی سے نہیں۔ یہ مدرسے سادہ طور پر عربی زبان اور دین اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے دیوبند کے مدرسہ میں تعلیم پائی ہے مگر یہ تعلیم سادہ طور پر دین کی تھی نہ کہ جنگ جوئی کی۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کئی نیشنل لیڈروں کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ہندستان واپس آنے کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں شریک ہو گئے۔ اب کیا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان لیڈروں کو لندن کے اسکولوں میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کی تعلیم دی گئی تھی۔

۱۹۴۷ سے پہلے جو لوگ آزادی کی تحریک میں شریک ہوئے اور ''انگریزو بھارت چھوڑو'' کا نعرہ لگایا وہ تقریباً سب کے سب ہندوستان کے ان انگریزی اسکولوں کے پڑھے ہوئے تھے جو برٹش دور میں قائم کئے گئے۔ ان کی بابت لارڈ میکالے نے کہا تھا کہ ان انگریزی اسکولوں کا مقصد یہ ہے کہ یہاں ایسی نسل پیدا ہو جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی ہو اور اپنی سوچ کے اعتبار سے انگریز۔ مگر انہیں انگریزی اسکولوں میں پڑھ کر لوگ انگریز کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس وقت انگریزی اسکولوں میں انگریزی حکومت کے خلاف لڑائی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

یہی معاملہ افغانیوں کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ افغانی نوجوانوں نے ہندستان کے دینی

مدرسہ میں داخلہ لے کر یہاں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اپنے وطن جاکر جب وہ وہاں کی عسکری تحریک میں شامل ہوگئے. تو اس کا کوئی تعلق ہندستان کے دینی مدرسہ سے نہ تھا۔ جنگ جوئی کا سبق انہوں نے خود اپنے ملک سے لیا۔ اس کا کوئی تعلق ان کی بیرونی تعلیم سے نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے یہاں کے مدرسہ میں حیدر آباد کا ایک طالب علم تھا۔ وہ جوڈو کراٹے سیکھے ہوئے تھا۔ مدرسہ کے قریب ایک نہر ہے۔ وہ اکثر اسی نہر پر جایا کرتا تھا۔ ایک روز وہاں ایک ہندو لڑکا تھا۔ وہ مذکورہ طالب علم کے پاس کھڑا ہو کر بار بار نہر میں کودتا تھا۔ اس کی وجہ سے طالب علم پر پانی کے چھینٹے آتے تھے۔ طالب علم نے منع کیا، وہ نہیں مانا تو طالب علم نے اس ہندو لڑکے کو مار دیا۔ وہ روتا ہوا گھر گیا۔ اس کے بعد اس کی ماں آئی اور طالب علم کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔ طالب علم نے اس ہندو عورت پر جوڈو کراٹے کا فن استعمال کیا۔

اس سے ہندو آبادی میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ وہ لوگ مدرسہ پر آئے۔ مولانا کبیر الدین صاحب نے کہا کہ یہ طالب علم کی غلطی ہے اور سب کے سامنے طالب علم سے معافی منگوائی۔ اس کے بعد معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔

تاہم ایسے سنگین معاملہ میں اتنی آسانی سے ہندوؤں کے ٹھنڈا پڑ جانے کا ایک پس منظر بھی تھا۔ اس سے پہلے مدرسہ کے طلبہ نے ہندو آبادی پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ مدرسہ سے ملے ہوئے ان لوگوں کے کھیت ہیں۔ مگر طلبہ چونکہ مدرسہ کے تحت ڈسپلن میں رہتے ہیں۔ انہوں نے کبھی ان ہندو کسانوں کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ایک بار گاؤں میں آگ لگ گئی تو تمام طلبہ دوڑ کر وہاں گئے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر آگ بجھائی۔ اس پیشگی اخلاقی اثر کی وجہ سے ہندو زیادہ مشتعل نہیں ہوئے۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے خود ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ مدرسہ والے غلط لوگ نہیں ہیں۔ اس میں غلطی دونوں کی ہو گی۔

میں نے کہا کہ اس سنگین معاملہ کو فساد تک پہنچنے سے جس چیز نے روکا وہ "جوڈو کراٹے" کا

فن نہیں تھا۔ بلکہ اخلاق اور حسن کردار تھا۔ ایک استاد کے الفاظ میں ایسا اس لئے ہوا کہ: ''ہم نے پہلے سے یہ ثابت کر رکھا تھا کہ ہم آپ کے ہمدرد ہیں۔ ہم آپ کے غم میں شریک ہیں''۔

حاجی ڈی خان (۱۹۲۷) مسروالا کے قدیم باشندہ ہیں۔ ۱۸ نومبر کی صبح کو ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ گورنمنٹ سروس کر رہے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے یہاں ۱۹۴۷ سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے اور ۱۹۴۷ سے بعد کا بھی۔ دونوں زمانوں میں کیا فرق ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت فرق ہے۔ پہلے دونوں فرقوں میں محبت تھی، اب دونوں کے اندر نفرت آگئی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پہلے کیوں محبت کا تعلق تھا۔ انہوں نے کہا کہ پہلے آپس میں ملنا جلنا خوب ہوتا تھا۔ شادی بیاہ میں دونوں ایک دوسرے کے یہاں جاتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شریک ہوتے تھے۔ کام دھندے میں بھی بار بار ملنا ہوتا تھا۔ اب دونوں میں دوری ہو گئی ہے۔

یہ بہت صحیح بات ہے۔ یہ سارا معاملہ اختلاط کا معاملہ ہے۔ دونوں میں دوبارہ خوش گوار تعلقات قائم کرنے کے لئے آج سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ اختلاط کی صورتیں پیدا کی جائیں۔

''ہمارے لوگوں میں قلبی لگاؤ نہیں خدا سے۔ دکھاوا زیادہ ہے، لگن کم ہے'' انہوں نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا۔ انہوں نے بتایا کہ مسروالا میں دو مسجدیں تھیں۔ اب ایک اور مسجد بنائی جارہی ہے۔

مولانا کبیر الدین صاحب جب اس علاقہ میں آئے تو پہلے وہ رائے پور میں مقیم ہوئے۔ وہاں آر ایس ایس کا ایک آدمی تھا جس کا نام سری نواس بنسل تھا۔ عام مسلمان اس سے نالاں تھے۔ مگر وہ مولانا کبیر الدین صاحب کا معتقد ہو گیا۔ حتی کہ جب وہ مسروالا آگئے تو وہ ان سے ملنے کے لئے یہاں آنے لگا۔ وہ مولانا کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ گاؤں میں جا کر کسی ہندو کے یہاں کھاتا۔ مگر مولانا کبیر الدین صاحب سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ سری نواس بنسل کو مولانا کبیر الدین صاحب کی سادگی، اصول پسندی، وقت کی پابندی اور کسی سے نفرت نہ کرنے کا مزاج اس کے لئے باعث کشش ثابت ہوا۔

۱۸ نومبر کو ناشتہ کرتے ہوئے میں نے مولانا کبیر الدین صاحب سے پوچھا: "کوئی ہندو اپنے بچہ کو مدرسہ میں داخل کرنا چاہے تو آپ داخل کریں گے" انہوں نے فوراً کہا کہ ہاں۔ پھر بولے: مگر دارالاقامہ میں نہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ اس کو یہاں تنگی ہوگی۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اگر وہ تنگی کو برداشت کرے تو، انہوں نے کہا پھر تو کوئی ہرج نہیں۔ ہم اس کو دارالاقامہ میں بھی رکھ لیں گے۔

عام طور پر مدارس کا یہ مزاج نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر مدرسہ میں کوئی ہندو بچہ ہوگا تو وہ مدرسہ کے ماحول کو خراب کرے گا۔ حالانکہ یہ بالکل بے بنیاد اندیشہ ہے۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں کے ماحول میں ایک غیر مسلم بچّہ ہو تو وہ خود متاثر ہوگا نہ یہ کہ وہ دوسروں کو متاثر کر ڈالے۔ اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں اسی ملک میں مسلم مدارس میں ہندو بچّے بھی پڑھتے تھے اور اس کا نتیجہ اسلام کے لئے بہتر صورت میں نکلتا تھا۔

۱۹۹۲ کے آخر میں کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ اعلان کیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو وہ بڑی تعداد میں اجودھیا میں داخل ہوں گے اور بابری مسجد کو توڑ کر وہاں رام مندر بنائیں گے۔ اس کے بعد ملک میں جگہ جگہ تناؤ پیدا ہو گیا۔ اسی اثناء میں نومبر ۱۹۹۲ میں پونٹا صاحب (ہماچل پردیش) کے پاس ایک گاؤں میں ایک اشتعال انگیز واقعہ ہوا۔ کچھ شر پسندوں نے ایک مسلمان کی زمین پر قبضہ کر کے رات کے وقت وہاں ایک مندر کی تعمیر شروع کر دی۔

دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں، ابھی چھت نہیں بنی تھی کہ وہاں مسلمان آگئے اور فرقہ وارانہ نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد پولیس کیس بن کر معاملہ عدالت میں پہونچا۔

عدالت نے تحقیقات کے بعد تعمیر کو غیر قانونی قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اس کو توڑ کر اس کی سابقہ حالت بحال کر دی جائے۔

اس کے بعد گاؤں میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں پولیس افسر، مقامی ہندو، علاقہ کے ایم ایل اے فتح سنگھ (بی جے پی) وغیرہ شامل تھے۔ مولانا کبیر الدین فاران مظاہری بھی اس میٹنگ میں علاقہ کے عالم کی حیثیت سے موجود تھے۔ لوگ کسی فیصلہ پر نہیں پہونچ رہے تھے۔ کیوں کہ پولیس اگر مندر کو گرادے تب بھی یہ اندیشہ تھا کہ نفرت اور کشیدگی بڑھے گی اور نئے مسائل کھڑے ہو جائیں گے جس کو روکنے کے لئے کوئی عدالت یا پولیس یہاں موجود نہ ہو گی۔

اس وقت مولانا کبیر الدین مظاہری نے جرأت مندانہ اخلاق کا ثبوت دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہاں پر ایک شبھ کام اشبھ انداز میں ہوا ہے۔ مگر اب چونکہ یہاں مندر کی ایک صورت کھڑی ہو گئی ہے تو لوگ اس کو مندر کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اگر اس کو توڑا جاتا ہے تو عوام میں یہ شور ہو گا کہ گاؤں کا ایک مندر توڑ دیا گیا۔ اس سے دونوں فرقوں میں نفرتیں پیدا ہوں گی اور مسئلہ پھر بھی نئی صورت میں باقی رہے گا۔ اس لئے اب ایسا کیا جائے کہ ہندو لوگ اپنا مندر تو وہیں پورا کر لیں۔ البتہ اس کے بجائے مالک زمین کو ایک اور جگہ اس کے معاوضہ میں دے دی جائے۔

اس پر سب لوگ متفق ہو گئے۔ مسلمان مالک کو دوسری زیادہ بہتر زمین اس کے معاوضہ میں دے دی گئی۔ مندر وہیں قائم رہا۔ مگر اس فیصلہ کا زبردست فائدہ یہ ہوا کہ مذکورہ ہندوؤں کے سر شرم سے جھک گئے۔ اوز مسلمانوں کو مستقل طور پر اخلاقی برتری حاصل ہو گئی۔

میں اپنے سر پر سفید پگڑی باندھتا ہوں۔ اس کے اندر ٹوپی نہیں ہوتی۔ ایک بزرگ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ آپ کا عمامہ سنت کے مطابق نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اس طرح عمامہ باندھتے تھے کہ اس کے اندر ٹوپی ہوتی تھی اور آپ کے عمامہ کے نیچے ٹوپی نہیں۔ میں نے کہا کہ اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ سنت اجمالی مطلوب ہوتی ہے نہ کہ سنت کلی۔ اور یہ عین فطرت کا تقاضا ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اگر کامل پیروی کو ضروری قرار دیا جائے تو جو لوگ ٹوپی

کے اوپر عمامہ باندھتے ہیں ان کا عمامہ بھی مسنون عمامہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عمامہ کا کپڑا ہاتھ کا بنا ہوا ہوتا تھا، جب کہ آج کل کے لوگوں کی ٹوپی اور عمامہ دونوں مِل کے کپڑے سے تیار کئے جاتے ہیں۔

مدرسہ کے ایک استاذ مولانا انصار الحق مظاہری نے بتایا کہ جب وہ چودہ سال کے طالب علم تھے، مدرسہ کی رسید لے کر وہ چندہ وصول کرنے گئے۔ ایک حکیم صاحب کے یہاں پہونچے جو باقاعدہ عالم بھی تھے۔ انہوں نے بہت سخت انداز اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں کسی مدرسہ والے کو چندہ نہیں دیتا۔ انصار الحق صاحب نے پوچھا کہ کیوں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ نے تجربہ کیا ہے یا قیاسی طور پر ایسا کہہ رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے اقرار کیا کہ انہوں نے اس سلسلہ میں کوئی ذاتی تجربہ نہیں کیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے اپنی الماری سے الجاحظ کی کتاب "اَلْحَیَوَان" نکالی۔ یہ غیر معرب تھی۔ انہوں نہ کہا کہ اس کتاب کو آپ نے دیکھا ہے۔ انصار الحق صاحب جو اس وقت کم عمر تھے، انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں کہا کہ دیکھا ہے۔ آپ کو یہ پوچھنا چاہئے کہ کیا اس کو پڑھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اچھا بتایئے، کیا آپ نے اس کو پڑھا ہے۔ انصار الحق صاحب نے کہا کہ میں نے اس کو پانچ بار پڑھا ہے۔ اور پھر اس غیر معرب نسخہ کو روانی کے ساتھ پڑھ کر سنانے لگے۔

اس طرح کے کتنے ذہین نوجوان ہمارے مدارس سے پڑھ کر نکلتے ہیں۔ مگر دور جدید کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے وہ سماج میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے پاتے۔ یہ لوگ اگر دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان بھی سیکھ لیں تو ان کی صلاحیتیں قوم کے لئے کئی گنا زیادہ مفید بن جائیں گی۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کی ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ ہمارے درمیان بڑی تعداد میں ایسے اہل علم ہوں جو بیک وقت عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں اسلام

کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ مگر ایسے افراد اتنے کم ہیں کہ وہ الشاذ کالمعدوم کے درجہ میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔

میں نے مدرسہ قادریہ کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ لوگ اپنے موجودہ نصاب کو چلاتے ہوئے ایک نئے کلاس کا اضافہ کریں۔ اس کو آپ لینگویج کلاس یا لینگویج کورس کہہ سکتے ہیں۔ اس میں صرف فارغ التحصیل افراد کو لیا جائے۔ عربی مدارس کے فارغین کو انگریزی زبان پڑھائی جائے اور انگریزی ادارہ کے تعلیم یافتہ افراد کو عربی زبان سکھائی جائے۔ فی الحال اس کی تعداد صرف دس ہو۔ پانچ عربی داں اور پانچ انگریزی داں۔ ان کو پڑھانے کے لئے دو معلم مقرر کئے جائیں۔ ایک عربی معلم اور ایک انگریزی معلم۔ مدرسہ کے ذمہ داروں نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ تاہم اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔ مزید تعاون کے بغیر شاید مدرسہ اس کام کو بحسن وخوبی انجام نہ دے سکے۔ اس سلسلہ میں جو لوگ شرکت یا تعاون کرنا چاہتے ہوں وہ ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کریں:

Maulana Kabiruddin Faran Mazahiri, Nazim, Madrasa Quadria,

Missarwala, Distt. Sirmour, Pin 173021,

Tel. 01704-55126, Fax : 01704-55286

ایک صاحب نے کہا کہ آخر کیا بات ہے کہ غیر مسلموں میں آپ کی بہت پذیرائی ہو رہی ہے، ہندوؤں اور عیسائیوں کے جلسوں میں خطاب کرنے کے لئے آپ بار بار بلائے جاتے ہیں، دور جدید میں یہ پہلا واقعہ ہے جو کسی مسلمان عالم کے ساتھ پیش آرہا ہے۔ آپ کے سوا کسی اور عالم کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا۔

میں نے کہا کہ یہ صرف اسلوب کے فرق کا معاملہ ہے، اصل یہ ہے کہ دوسرے عالم اور رہنما اسلام کو دفاعی نقطہ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ جب کہ میں اسلام کو دعوتی اعتبار سے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے دوسری قوموں کو اسلام کا دشمن سمجھ لیا۔ اس بنا پر ان کی تقریروں میں

مناظرانہ اور حریفانہ رنگ آگیا۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں کسی کو بھی اسلام کا دشمن نہیں سمجھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے اس بنا پر اسلام ہر انسان کا اپنا مطلوب دین ہے۔

میری اس سوچ کی بنا پر میری تقریر میں مذمت کے بجائے محبت ہوتی ہے۔ اس میں اظہار فخر نہیں ہوتا۔ اس میں مناظرہ بازی نہیں ہوتی۔ وہ فطرت کو جگاتی ہے اور ان کے سامنے خدا کے دین کا مثبت تعارف پیش کرتی ہے۔ میں ہندو یا عیسائی کے مقابلہ میں مسلمان کا کیس پیش نہیں کرتا۔ بلکہ سب کو خدا کا بندہ مان کر ان کے سامنے خدا کی بات پیش کرتا ہوں۔ اسلوب کا یہی فرق ہے جس نے ان کی نظر میں میری بات کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔

ہماچل پردیش کے مختلف حصوں کا سفر کرتے ہوئے میں نے پایا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ نفرت اور تعصب نہیں ہے جو دہلی اور یوپی کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ دونوں خطوں میں اس اعتبار سے واضح فرق ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ دہلی اور یوپی کا علاقہ عرصۂ دراز تک سیاسی لوگوں کا مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اس طرح اس علاقہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا ماحول قائم ہو گیا۔ اس کے برعکس ہماچل پردیش کا علاقہ کبھی بھی اس قسم کی فرقہ وارانہ سیاست کا مرکز نہیں رہا۔ اسی فرق نے دونوں خطوں کے درمیان وہ فرق پیدا کر رکھا ہے جس کو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

انسانی سرگرمیوں کو اگر دو قسم میں بانٹا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ سیاسی سرگرمیاں باہمی نفرت پیدا کرتی ہیں اور تعمیری سرگرمیاں باہمی محبت۔

مدرسہ میں ایک مسلمان بڑھئی کام کر رہے تھے ان کا نام محمد حنیف ہے۔ اس وقت یہاں مسجد میں ماربل لگانے کا کام بھی ہو رہا تھا۔ مذکورہ بڑھئی نے کئی روز ماربل کے مستریوں کو دیکھا۔ انھیں ان کا کام اچھا نہیں لگا۔ اگرچہ خود انھوں نے کبھی ماربل کا کام نہیں کیا تھا اور نہ اس کو کہیں سیکھا تھا۔ تاہم اپنے اندرونی جذبہ کے تحت انہوں نے مدرسہ کے ذمہ داروں سے کہا کہ ماربل لگانے کا کام آپ مجھے دے دیں، میں اس کو کروں گا۔ چنانچہ یہ کام انہیں دے دیا گیا۔ اس کے بعد

انہوں نے ماربل لگانے کا کام شروع کیا اور مستریوں سے کہیں زیادہ اچھا لگایا۔ میں نے بعد میں چاروں طرف دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ کام کسی ماہر کاریگر نے کیا ہے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ ایک نئے آدمی نے انجام دیا ہے۔

مسلمان آج کل ہر جگہ کاریگری کے کام میں آگے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ تعلیمی پس ماندگی نے ان کے اندر نیا جوش پیدا کیا۔ وہ سرگرمی کے ساتھ کاریگری کے کام میں لگ گئے جس میں تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ آدمی اگر ایک میدان میں ناکام رہے، تو وہ دوسرے میدان میں اپنی جگہ بنالیتا ہے۔

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ پہلے تو لوگ آپ کی چیزیں بہت شوق کے ساتھ پڑھتے تھے۔ مگر جب آپ نے کہا کہ مسلمان بابری مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دیں تو لوگ آپ کے خلاف ہو گئے۔ میں نے کہا کہ یہ تو ایک لغو بات ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد میں نے صرف یہ کہا تھا کہ مسلمان اب اس اشو پر عملاً خاموشی اختیار کر لیں۔ اور آپ دیکھئے تو تمام کے تمام مسلمان، خواہ اصاغر ہوں یا اکابر، سب اس اشو پر خاموشی کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں ۔گویا اس معاملہ میں فارسی شعر کا معاملہ ہے کہ:

آنچہ دانا کند کند ناداں　　　لیک بعد از خرابیٔ بسیار

۶ دسمبر کے بعد مسلم رہنماؤں نے یہ مانگ شروع کر دی کہ "مسجد دوبارہ وہیں بناؤ" جب کسی نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا تو اب وہ خاموش ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا اس کی جگہ مالک بنا۔ ایک ملازم نے جوش کے انداز میں لڑکے سے کہا کہ "میری تنخواہ بڑھایئے ورنہ..." لڑکے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا: "ورنہ تم کیا کرو گے"۔ اب ملازم دھیمی آواز میں بولا: "اسی تنخواہ پر کام کریں گے"۔

یہی معاملہ ان نام نہاد رہنماؤں کا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسجد وہیں بناؤ ورنہ ... جب ذمہ داروں نے انہیں نظر انداز کر دیا تو اب وہ بزبان حال کہہ رہے ہیں "پھر ہم بھی خاموشی اختیار

کرلیں گے"۔

۱۸ انومبر کی سہ پہر کو مسروالا سے ناہن کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ہارٹی کلچر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دیکھا۔ اس کا یہاں بہت بڑا فارم ہے۔ ایک باغ میں کینو کے خوبصورت پھل لگے ہوئے تھے۔ ہری شاخوں کے درمیان لال رنگ کے پھل فطرت کے حسن کا مظاہرہ کررہے تھے۔

کینوایک نیا پھل ہے جو موسمی اور سنترے کی قلم تیار کر کے بنایا گیا ہے۔ اس میں رس کی مقدار دونوں ہی سے زیادہ ہوتی ہے۔

اس کے آگے شکتی نگر میں کچھ دیر کے لئے ٹھہرے۔ یہاں ایک افسر مسٹر یعقوب بیگ ہیں۔ ان سے ملنے کے لئے ہم لوگ چند منٹ رکے تو اندر سے مسٹر آر ایس ورمانکل آئے جو بجلی بورڈ میں سپرنٹنڈنگ انجینئر ہیں۔ (Tel. 01702-22281) انہوں نے کہا میں اخباروں میں آپ کے آرٹیکل پڑھتا رہا ہوں، اور میرے پاس ان کی کلپنگ بھی ہے۔ مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

راستہ میں مولانا کبیر الدین صاحب نے ایک بڑے کام کی بات کہی، انہوں نے کہا کہ:
"اگر ہمیں دین کا کام کرنا ہے تو ہم کو اسٹیج اور مظاہرہ کا طریقہ چھوڑنا ہوگا"۔

مغرب کی نماز ہم لوگوں نے ناہن میں پڑھی۔ یہاں چار مسجدیں ہیں۔ مسجد کچا تالاب بس اسٹینڈ کے بالکل قریب ہے اور کافی آباد ہے۔ اس مسجد میں نماز مغرب کے بعد جلسہ کا پروگرام رکھا گیا تھا۔

جلسہ سے پہلے کچھ دیر ہم لوگ امام صاحب قاری حسین احمد کے کمرہ میں بیٹھے۔ یہاں صدر انجمن جناب شیخ نثار احمد ایڈوکیٹ بھی آگئے۔ وہ میرے مضامین پڑھتے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری پالیسی وہی ہے جو آپ بتاتے ہیں۔ یعنی ٹکراؤ سے نہیں بلکہ پیار سے۔

یہ علاقہ ریاست سرمور میں شامل تھا۔ ۱۹۴۷ میں یہاں کے راجہ راجندر پرکاش تھے۔

تمام مسلمان ان کی تعریف کرتے ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ ۱۹۴۷ میں جب ہر طرف فساد پھیل گیا تو راجہ راجندر پرکاش نے مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اپنی فوج لگادی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایک مسلمان بھی یہاں سے چھوڑ کر جائے۔

ڈاکٹر حشمت علی صاحب بھی کمرہ میں آگئے۔ وہ یہاں مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانے کے لئے کافی کام کررہے ہیں۔ انہوں نے ایک بات یہ بتائی کہ ناہن میں دینی کام سب کا سب مقامی چندہ سے ہوتا رہا ہے۔ یہاں کا آدمی کبھی بھی باہر چندہ مانگنے کے لئے نہیں گیا۔

حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: ”ناہن کے مسلمانوں میں جو اجتماعیت ہے وہ بہت کم کسی شہر میں دکھائی دے گی۔“

۱۸ نومبر کی شام کو مغرب اور عشاء کے درمیان تقریر کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام مسجد کے اندر رکھا گیا تھا۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ لیکن شہر کے معروف ہندو بھی قابل لحاظ تعداد میں موجود تھے۔ مہاراجہ سرمور کی بہو انجنا سنگھ بھی شریک تھیں۔ مسٹر آر ایس ورما (سپرنٹنڈنگ انجینئر) اور دوسرے کئی اعلی تعلیم یافتہ ہندو آئے۔ سب نے کہا کہ ہم آپ کے آرٹیکل اخباروں میں پڑھتے تھے۔ اور ہم کو آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

R.S. Verma, S.E. (Gen.) Nahan, (H.P.) Pin- 173001

Tel. 2281 (R) 2282 (O), 2437 (O) STD Code- 01702

ناہن سے رات ہی کو ہم لوگ مسروالا کے مدرسہ میں واپس آگئے۔ یہ مدرسہ بستی سے کچھ باہر واقع ہے۔ ۱۹ نومبر کو میں نے مدرسہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی۔ نماز کے فوراً بعد بستی کے ایک صاحب ملے۔ انہوں نے بستی آکر یہاں کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھی تھی۔ انہوں نے کہا کہ بستی میں لوگ منتظر ہیں کہ آپ وہاں چل کر انہیں کچھ دین کی باتیں بتائیں۔ فجر کی نماز مدرسہ میں اول وقت غلس میں ہوتی ہے۔ اور بستی کی مسجد میں دیر کے بعد اسفار میں۔ اس طرح ہم لوگوں کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ مدرسہ میں نماز ادا کرنے کے بعد وقت پر بستی کی نماز میں پہنچ

سکیں۔

نماز کے بعد مستری یوسف صاحب کے اصرار پر ان کے گھر پر صبح کی چائے پی گئی۔ یہاں بستی کے کچھ لوگ جمع ہو گئے۔ ان سے مختصر گفتگو ہوئی۔ واپسی کے بعد صبح ۹ بجے میری قیام گاہ پر مدرسہ کے اساتذہ اور کچھ دوسرے افراد اکھٹا ہوئے۔ ان کے سامنے علم دین کے موضوع پر گفتگو ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف علمی واقعات ماضی اور حال کے سنائے۔ جس میں ہر ایک کے لئے سبق تھا۔

مدرسہ قادریہ اور اطراف کی مسجدوں کی تعمیر میں خاص طور پر جناب حاجی موسی بٹلہ صاحب اور جناب ایف ڈی ریاض الدین وغیرہ کا خصوصی حصہ رہا ہے۔ اس علاقہ کی مسجدیں اور مدرسے ایک زندہ علامت کے طور پر بتا رہے ہیں کہ اہل مال کھلے دل کے ساتھ اہل دین کا تعاون کر رہے ہیں۔ اہل مال اور اہل دین کا یہ اشتراک بلاشبہ ملت کا قیمتی سرمایہ ہے۔

مہمان خانہ کے جس کمرہ میں یہاں میں ٹھہرا تھا، اس کے اندر ایک بڑی الماری تھی جس میں بہت سی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ انھیں میں سے ایک کتاب مصنّف ابن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ) کا مکمل سٹ تھا جو ۱۹۸۶ میں کراچی سے تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

اس کے مختلف حصوں کو دیکھا۔ اس میں زیادہ تر احکام ومسائل والی روایات ہیں۔ الجزء العاشر میں فضائل القرآن کے باب میں ایک روایت میں بتایا گیا تھا کہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں یہ کہنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ میں نے پورا قرآن پڑھ لیا (قرأت القرآن کله) حدیث نمبر ۱۰۱۴۱ میں یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا کہ میں نے پورے قرآن کو پڑھ لیا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم نے اس میں سے حاصل کیا کیا (قال رجل قرأت القرآن کله. قال عبدالله بن عمر : وما ادرکت منه)

دور اول میں لوگوں کی توجہ اس پر ہوتی تھی کہ انہوں نے قرآن کے کسی حصہ کو پڑھا تو اس سے کیا حاصل کیا۔ اب ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ انہوں نے قرآن کو کتنی بار ختم کیا۔

پہلے قرآن کے معنوی پہلو پر زور دیا جاتا تھا، اب اس کے الفاظ ہی کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ دور اول کے مقابلہ میں موجودہ دور میں جو فرق ہے وہ اصل میں یہی ہے۔

۱۹ نومبر کو فجر کی نماز میں ایک بوڑھے مسلمان حاجی محمد رمضان بھی موجود تھے۔ وہ فتح پور کے رہنے والے تھے جو یہاں سے ڈھائی کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ان کے یہاں مسجد نہیں تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے یہاں کی فضا خراب ہوئی، اسی زمانہ میں مسلمانوں میں شوق ہوا اور انہوں نے یہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈال دی۔

مسجد کی تعمیر شروع ہوئی تو مقامی ہندو رکاوٹ ڈالنے لگے۔ ہندوؤں کی رکاوٹ سے وہاں کشیدگی کا ماحول پیدا ہو گیا، جب حالات زیادہ خراب ہو گئے تو وہاں پولیس افسر اور ایس۔ ڈی ایم سٹی جے۔ سی۔ چوہان (موجودہ اے ڈی ایم شملہ) تھے۔

پولیس آئی تو مسلمان چپ رہے۔ مگر ہندوؤں نے جوش دکھایا۔ گاؤں کے ہندو چودھری کالڑکا بھی وہاں آگیا۔ وہ اس وقت شراب پئے ہوئے تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ یہاں کبھی مسجد نہیں تھی۔ اس لئے یہاں ہم ہرگز مسجد بننے نہیں دیں گے۔ اس کی اس زیادتی پر پولس افسر اور ایس ڈی ایم کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا "اس وقت تو میں میٹھی گولی دے رہا ہوں۔ میرے پاس کڑوی گولی بھی ہے" اس نے باقاعدہ مسلمانوں کی حمایت شروع کردی۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ اپنی زمین پر اپنے پیسہ سے مسجد بنا رہے ہیں تو تم کو کیا مصیبت پیش آرہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ پولیس مسلمانوں کی حمایت پر کھڑی ہو گئی۔ یہاں تک کہ مسجد مکمل ہو گئی۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز قائم ہے۔ حاجی محمد رمضان صاحب (۶۵ سال) اس مسجد کے امام ہیں۔

۱۹ نومبر کو مسروالا سے سہارن پور کے لئے روانگی ہوئی۔ راستہ میں پونٹا آیا۔ وہاں ہم لوگ کچھ دیر کے لئے مسٹر اشوک کمار شرما کے مکان پر ٹھہرے۔ یہیں پر پنجاب کیسری کے نمائندہ ڈاکٹر برجیندر کمار آگئے۔ انھوں نے اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ پنجاب کیسری اس وقت پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار ہے۔

انھوں نے ایک سوال یہ کیا کہ مذہب زیادہ بڑا ہے یا انسانیت۔ میں نے کہا کہ اس قسم کا تقابل فٹ اور میٹر میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اس قسم کا تقابل درست نہیں۔ مثلاً کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کی ماتا زیادہ قابلِ عزت ہیں یا آپ کے پتا۔ تو آپ کہیں گے کہ میرے لئے تو ماتا اور پتا دونوں یکساں طور پر قابلِ عزت ہیں۔

یہی معاملہ مذہب اور انسانیت کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں ہی کی اہمیت ہے۔ اور جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، تو سچے مذہب میں انسانیت اپنے آپ شامل ہوتی ہے۔

مولانا ممتاز احمد قاسمی نے بتایا کہ ۱۹۸۴ میں کشمیر میں نوجوانوں نے مندر جلا دیا تھا۔ اس پر شملہ کے ہندو بپھر گئے۔ انہوں نے جلسہ کیا اس میں اس قسم کی تقریریں کیں کہ شملہ کی ایک ایک مسجد کو ہم جلا دیں گے۔ کوئی مسجد یہاں دکھائی نہیں دے گی۔

اس وقت شملہ کا ڈپٹی کمشنر آف پولیس مہندر لال تھا۔ وہ ہندوؤں کے یہاں گیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم شملہ کی مسجدوں یا یہاں کے مسلمانوں کے گھروں کو جلانا چاہتے ہو تو شوق سے جلاؤ۔ تم جتنا مانگو، تیل اور پٹرول تم کو دینے کے لئے میں تیار ہوں، مگر ایک بات سن لو۔ آگ جب بھڑکے گی تو وہ ہندو اور مسلمان نہیں دیکھے گی۔ وہ مسلمانوں کے گھروں کے ساتھ تمہارے گھروں کو بھی جلائے گی۔ اس وقت تم فائر بریگیڈ مانگو گے تو میں ایک بھی فائر بریگیڈ نہیں دوں گا۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈے ہو گئے اور شملہ میں کوئی جوابی فساد نہیں ہوا۔

پونٹا صاحب سے آگے بڑھے تو میلوں تک ہمارا سفر اس علاقہ سے ہوا جس کو دون وادی (Doon Valley) کہا جاتا ہے۔ سڑک کے دونوں طرف نہایت پرکشش قدرتی مناظر تھے۔ سبز پوش پہاڑوں کی بلندی، رواں دواں نہر، دور تک نشیب و فراز میں پھیلی ہوئی ہریالی، اس کے اوپر نیلا آسمان، قدرتی حسن کے اس ماحول نے ہمارے سفر کو ایک رومانی سفر بنا دیا۔

تاہم اسی کے ساتھ ایک تلخ احساس میرا پیچھا کرتا رہا۔ یورپ اور امریکہ میں میں نے اس قسم کے زمینی خطے بار بار دیکھے ہیں۔ وہاں کا حال یہ ہے کہ انسانی منصوبہ بندی نے اس کو ڈیولپ کر

کے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے درمیان جو سڑکیں اور راستے بنائے گئے ہیں وہ نہایت عمدہ ہیں۔ جب کہ یہاں یہ حال تھا کہ ناہموار اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی سڑکیں، اسی کے ساتھ حسن کاری کا شدید فقدان۔ انسان کی نسبت سے سہولتوں کی عدم موجودگی، وغیرہ۔

سہارن پور آتے ہوئے ایک بار ایک ٹرک سامنے آگیا۔ ہمارے ڈرائیور نے بار بار ہارن دیا مگر وہ سائڈ نہیں دے رہا تھا۔ آخر کار ہمارے ڈرائیور نے گاڑی کو سڑک سے نیچے اتار کر اس کو آگے بڑھایا۔

میں سمجھا کہ ٹرک ڈرائیور شاید پئے ہوئے تھا یا وہ سرکشی کی بنا پر سائڈ نہیں دے رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا کہ وہ آخر سائڈ کیوں نہیں دے رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اس کا سائلنسر نکلا ہوا تھا۔ اس کا اپنا ٹرک اتنا زیادہ شور کر رہا تھا کہ وہ ہمارے ہارن کی آواز نہ سن سکا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیسے جانا۔ ڈرائیور نے کہا کہ ٹرک کی آواز سے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی کس طرح غلط استنباط کرتا ہے اور کسی کے بارہ میں ایک ایسی رائے قائم کر لیتا ہے جو بالکل بے بنیاد ہوتی ہے۔

مولانا انصار الحق مظاہری یہاں کے ایک لائق استاذ ہیں انہوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے اکابر نے یہ فتوی دیا تھا کہ ہندوستان دار الحرب ہو چکا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ یہاں اسلامی شعائر کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد جو دور آیا اس میں شعائر کی بے حرمتی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور مذہبی آزادی میں پہلے سے زیادہ رخنے ڈالے جانے لگے۔ مگر اب ہمارے علماء اس ملک کے دار لحرب ہونے کا فتوی نہیں دے رہے ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

یہ سوال قابل غور ہے۔ اگر ۱۹۴۷ سے پہلے کانپور کی مسجد کا صرف غسل خانہ توڑے جانے سے ہندستان دار الحرب بن سکتا تھا تو آج وہ شدید تر معنوں میں دار الحرب قرار پائے گا۔

کیوں کہ آج پوری مسجد توڑ کر اس کو مٹادیا گیا ہے۔

اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان کو دارالحرب قرار دینے کا جو فتوی دیا گیا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک سیاسی فتوی تھا۔نہ کہ کوئی دینی فتوی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ثنائیت (dichotomy) بجائے خود درست نہیں۔اس فقہی تقسیم کے مطابق، جو ملک دارالاسلام نہ ہو وہ دارالحرب قرار پاتا ہے۔ حالانکہ " دار " کی اور بھی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ دارالدعوۃ اور دارالامن، وغیرہ۔

میرے نزدیک ہندستان نہ ۱۹۴۷ سے پہلے دارالحرب تھا اور نہ وہ ۱۹۴۷ کے بعد دارالحرب ہے۔ اس قسم کی دو گونہ تقسیم قرآن وحدیث میں موجود نہیں۔ وہ عباسی دور کے بعض فقہاء نے زمانی حالات کی بناء پر بنائی تھی۔ اس تقسیم کو شریعت کی طرح ابدی قرار دینا ہر گز درست نہیں۔

شام کو ہم لوگ رائے پور پہنچے۔ یہاں کچھ دیر مدرسہ فیض ہدایت رحیمی میں ٹھہرے۔ عصر کی نماز بھی اسی مدرسہ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ مدرسہ کے مہمان خانہ میں اساتذہ جمع ہو گئے۔ ان کے سامنے بعض موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ مدارس کے لئے آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ مدارس خدا کے فضل سے بہت اہم کام انجام دے رہے ہیں۔ وہ ملت کے خیمہ کے لئے کھونٹے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کل مدارس کے خلاف جو بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو دور کرنے کا حل نہ احتجاج ہے اور نہ حکومت کے ذمہ داروں سے مل کر مطالبات کا میمورنڈم پیش کرنا۔ اس کا حل یہ ہے کہ ہم خود کوشش کر کے لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ اس کا سب سے طاقتور ذریعہ یہ ہے کہ مدارس قرآن کی آیت **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** کا مصداق بنیں۔ اپنے ماحول میں اپنے آپ کو نفع بخش بنائیں اور اس طرح اپنے لئے ایک نئی زندگی کا استحقاق ثابت کریں۔

ظہر کی نماز کسی قدر تاخیر کے ساتھ بادشاہی باغ کی مسجد میں پڑھی گئی۔ میں نے سوچا کہ سڑک کے کنارے مسجدوں کا ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہاں مسلمان وقفہ وقفہ سے کچھ وقت کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ وہ وضو کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ سفر کے دوران بار بار وہ ان مسجدوں میں لمحاتی قیام کر کے خدا کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے سفر دنیا کو سفر آخرت کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد ہماری گاڑی ایک مقام پر مڑی اب وہ رائے پور جا رہی تھی۔ یہ پانچ کیلو میٹر کا راستہ اس طرح طے ہوا کہ سڑک کے کنارے بہتی ہوئی نہر، اور پھر دونوں طرف دور تک سر سبز مناظر۔ اس کو دیکھ کر میرے سینہ میں شکر کا بے پناہ جذبہ ابھر آیا۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں مومن کی سب سے بڑی کمائی یہ ہے کہ وہ شکر خداوندی کا رزق پا سکے۔ دنیا کے کسی خطۂ ارض میں جب تک مومن کو شکر الٰہی کا رزق مل رہا ہے وہ محروم نہیں ہے۔ وہ عظیم سرمایہ کا مالک ہے۔ اس نعمت کے ملتے ہوئے دوسری چیزوں سے محرومی پر واویلا کرنا ایک قسم کی ناشکری ہے جو مومن کے لئے جائز نہیں۔

سہارن پور میں ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک مسجد ہے۔ یہاں مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر اٹھا تو میرے ساتھی مسجد میں نظر نہیں آئے۔ میں حیران تھا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ساتھی آئے۔ ان سے اصل بات معلوم ہوئی۔

سہارن پور سے مجھے شتابدی اکسپریس کے ذریعہ دہلی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس کا وقت یہاں سے ساڑھے آٹھ بجے ہے۔ مگر مسجد میں کسی نے بتایا کہ سہارنپور سے اس کا وقت ساڑھے چھ بجے ہے۔ چنانچہ میرے ساتھی تیزی سے چل کر اسٹیشن پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ سہارن پور سے اس کا رزرویشن کوٹہ نہیں ہے۔ اس لئے اگر سیٹ ہو تو ٹرین پر ہی ٹکٹ مل سکتا ہے۔ یہ ایک غیر یقینی بات تھی۔ چنانچہ وہ لوگ اسٹیشن کے افسر اعلیٰ سے ملے۔ یہ مسٹر جوگندر سنگھ تھے۔

Mr. Joginder Singh, Station Superintendant

Rly. Station, Saharanpur Jn. (Tel. 744853)

مسٹر جوگیندر سنگھ نہایت شریف آدمی ہیں اور علمی ذوق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہم لوگوں کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ اس کے بعد انہوں نے ٹیلی فون کر کے اسٹیشن کے ایک صاحب کو بلایا اور ان سے کہا کہ "مولانا صاحب کے لئے ایک ٹکٹ کا انتظام کرو" وہ آدمی ہمارے ایک ساتھی کو لے کر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹکٹ مجھے مل چکا تھا۔ مسٹر سنگھ نے مزید یہ کیا کہ وہ اپنے آفس سے اٹھ کر ہم لوگوں کے ساتھ ٹرین تک آئے۔ جب انہیں پورا اطمینان ہو گیا کہ مجھے سیٹ مل چکی ہے، اس کے بعد وہ واپس گئے۔

گفتگو کے دوران مسٹر جوگندر سنگھ نے بہت سی قابل تذکرہ باتیں کیں۔ انہوں نے کہا کہ اب مجھے ریٹائر ہونے میں صرف چھ مہینے باقی ہیں۔ جب میں نے سروس شروع کی تھی تو اس وقت لوگ ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے۔ آج یہ حالت ہے کہ "کسی کو اچھی بات سکھانے کی کوشش کرو تو وہ سیکھنا نہیں چاہتا۔ ہر آدمی سمجھتا ہے کہ جتنا مجھے آتا ہے اتنا کسی کو نہیں آتا۔ چاہے حقیقت میں وہ کچھ نہ جانتا ہو"۔

شتابدی اکسپریس میں ہر چیز بالکل ہوائی جہاز کے انداز پر بنائی گئی ہے۔ وہ ہندستان کی نہایت تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے۔ وہ سوا سو کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے۔ تاہم میں اس کے اندر اس طرح پر سکون طور پر نہیں لکھ سکتا تھا جس طرح میں ہوائی جہاز کے سفر میں ہمیشہ لکھتا ہوں۔ اس کے وجہ یہ تھی کہ وہ مسلسل اتنی زیادہ ہلتی ہے کہ قلم کو کاغذ پر جمانا مشکل ہو جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہندستان میں ہر معاملہ میں ترقی یافتہ ملکوں کی نقل کی جارہی ہے، جب کہ ترقی یافتہ ملکوں والی بیس (base) یہاں موجود نہیں۔ شتابدی اکسپریس اتنی زیادہ اس لئے ہلتی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں جیسی مظبوط پٹریاں یہاں بچھائی نہیں گئیں۔ اسی طرح آزادی ہمارے یہاں

انار کی اس لئے بن گئی کہ اس کے لئے سلف ڈسپلن کی بیس موجود نہ تھی۔ جمہوریت ہمارے یہاں اس لئے ناکام ہے کہ ایجوکیشن میں ہمارا ملک ابھی بہت پیچھے ہے، جب کہ ایجوکیشن ہی جمہوریت کی بنیاد ہے، وغیرہ۔

۱۹ نومبر کو ٹرین ٹھیک وقت پر دہلی پہونچی۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو ایک صاحب میرے قریب آئے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ "صوفی نور خان" ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد انہوں نے میرا نام پوچھا، میں نے انہیں نام بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا الرسالہ تو میں پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

انہوں نے مزید کہا کہ آپ الرسالہ میں حقیقت پسندی کی جو تعلیم دیتے ہیں، اگر میں اسی پر چلتا تو میں ایک بڑے نقصان سے بچ جاتا۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے جلد دولت کمانے کے جوش میں اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ بڑا ایک صنعتی یونٹ لگا لیا۔ وہ اس کو چلانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اب وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد جب میں اسٹیشن سے گھر کی طرف روانہ ہوا تو شہر کے مختلف مناظر کو دیکھنے کے بعد یہ خیال آیا کہ اس کی ذمہ داری تنہا ایک شخص پر نہیں بلکہ پورے مسلم معاشرہ پر ہے۔ موجودہ مسلم معاشرہ کا حال یہ ہے کہ اس میں نشو ونما پانے والا ایک شخص کہیں بھی سنجیدگی اور حقیقت پسندی کی تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ وہ اس معاشرہ میں جہاں بھی جاتا ہے اس کو ہر جگہ فخر پسندی اور جذباتیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر کوئی بھی شخص اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ وہ دوسرے کو صحیح اور خیر خواہانہ مشورہ دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی خودرو پودے کی طرح اگتا ہے۔ صحیح معاشرہ وہ ہے جو افراد کے لئے اس کی زندگی کی تعمیر میں معاون بنے مگر موجودہ مسلم معاشرہ اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر یہ ذمہ داری ادا نہیں کر پاتا۔ اس کا نتیجہ مختلف شکلوں میں ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

سفر سے واپسی کے بعد نظام الدین کی کالی مسجد میں نماز کے لئے گیا تو یہاں ایک پوری

تاریخ یاد آ گئی۔ یہ مسجد جس کو کالی مسجد یا کلاں مسجد کہا جاتا ہے، آج ایک وسیع اور شاندار مسجد دکھائی دیتی ہے۔ مگر ۱۹۴۷ میں یہ ایک کھنڈر کی صورت میں تھی جس پر کچھ لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ میوات کے حافظ عبدالغفور صاحب نے اس کو دوبارہ آباد کرنے کی خاموش کوشش شروع کر دی ــــــ لمبی جدو جہد کے بعد یہ مسجد دوبارہ مسلمانوں کو مل گئی۔ اس کے بعد حافظ عبدالغفور صاحب کے بھانجے مولانا محمد ہارون صاحب کی مسلسل کوشش کا مزید نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ مسجد اس علاقہ کی سب سے زیادہ شاندار مسجد کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ حافظ عبدالغفور صاحب ۷۲ سال کی عمر میں دسمبر ۱۹۹۲ میں وفات پا گئے۔

حافظ عبدالغفور صاحب بظاہر ایک غیر معروف شخص تھے مگر انھوں نے معروف شخصیتوں سے زیادہ بڑا کام کیا۔ ان کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ غیر آباد مسجدیں آباد ہوں اور مدارس کا قیام زیادہ سے زیادہ عمل میں آئے۔ انھوں نے اپنی لگن اور جدو جہد سے ۲۲ غیر آباد مسجدیں آباد کرائیں۔ ۱۵ مدرسے قائم کیے۔ دہلی میں جو مسجدیں انھوں نے آباد کرائیں ان میں سے چند یہ ہیں: فیروز شاہی جامع مسجد، بستی نظام الدین۔ جامع مسجد ڈیفنس کالونی، جامع مسجد خیر المنازل بالمقابل چڑیا گھر، مسجد پنج پیراں وغیرہ۔ اسی طرح مدرسہ زینت القرآن حوض رانی، مدرسہ اشاعت الاسلام (واقع فیروز شاہی جامع مسجد)، مدرسہ تعلیم القرآن جامع مسجد ڈیفنس کالونی، وغیرہ۔

حافظ صاحب نے جب بھی کوئی مسجد آباد کی یا کوئی مدرسہ قائم کیا تو ان مقامات پر اپنا قبضہ جمانے کے بجائے لائق شخصیات کو وہاں متعین کر کے ان کو ان کے حوالے کر دیا، مثلاً خیر المنازل میں مولانا الیاس امینی کو امام متعین کیا۔ اسی طرح ڈیفنس کالونی کی جامع مسجد میں مولانا محمد عیسیٰ کو امام مقرر کیا۔ وہ مدرسہ تعلیم القرآن کے مہتمم اور ناظم بھی ہیں۔ مولانا عیسیٰ نے اپنی محنت سے اس مسجد اور مدرسہ کو کافی وسیع کر لیا ہے۔ وہاں آج ہزاروں کی تعداد میں مسلمان نماز جمع و عیدین ادا کرتے ہیں۔ کلاں مسجد بستی نظام الدین میں اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون (موجودہ امام و خطیب

)کو مقرر کیا۔ حافظ عبدالغفور صاحب اپنے بھتیجے مولانا محمد ہارون کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے اور اس طرح ان کی تربیت کرتے رہتے۔ ابتداء سے ہی کلاں مسجد بستی نظام الدین کا نظم وضبط مولانا ہارون کے ذمہ رکھا۔ مولانا ہارون صاحب کا کام گویا کہ حافظ صاحب کے خواب کی عملی تعبیر ہے۔ مولانا ہارون آج بھی کلاں مسجد کی تعمیر وتوسیع کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مسجد کے اندر حافظ صاحب کا قائم کیا ہوا مدرسہ اشاعت الاسلام بھی ترقی کر رہا ہے۔ اس میں بیرونی طلبہ کے قیام وطعام کا معقول انتظام ہے۔ دوسری جگہوں کی نگرانی بھی حافظ صاحب نے انہیں کے سپرد کی۔ تمام مقدمات کی پیروی بھی مولانا ہارون صاحب ہی کرتے رہے۔ مولانا ہارون صاحب کو آخر وقت تک حافظ صاحب کی یہی تاکید تھی کہ مسجد کو کبھی سیاسی اکھاڑہ نہ بننے دینا۔

حافظ صاحب کی عمر کا ایک طویل عرصہ آثار قدیمہ، ڈی ڈی اے، کارپوریشن، تیس ہزاری کورٹ، دہلی وقف بورڈ اور جمعیۃ علماء کے چکر کاٹنے میں گزرا۔ کیوں کہ انہیں پرامن اور قانونی ذرائع سے انھوں نے یہ کامیابی حاصل کی اور ایک تعمیری جدوجہد کی تاریخ چھوڑی۔

۱۹۴۷ کے بعد مسلمانوں میں بہت سے مثبت کام ہوئے ہیں۔ یہ تمام کام زیادہ تر انھیں لوگوں نے کئے ہیں جنھوں نے مسجد اور مدرسہ کو اپنے عمل کا میدان بنایا اور خاموش اور پرامن انداز کو اپنی جدوجہد کے لئے اختیار کیا۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جس کو عام طور پر سیاسی طریقہ کہا جاتا ہے، ایسے لوگوں نے ملت کو صرف نقصان پہنچایا، وہ ملت کو کوئی بھی مثبت تحفہ نے دے سکے۔

حافظ عبدالغفور صاحب جیسے بہت سے خاموش دینی خادم ملک میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد اور مدرسے کی راہ سے کام کرنے کا طریقہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز طریقہ ہے، سیاسی ہنگامہ آرائی صرف شخصی لیڈری ہے نہ کہ واقعی معنوں میں کوئی ملی اور دینی کام۔

سوال

بیسویں صدی میں ساری دنیا میں اسلام کے نام پر بہت سی تحریکیں اٹھیں۔ ان سب کا نشانہ اسلام کا احیاء تھا اور ملت اسلامیہ کو دوبارہ سر فرازی کا مقام دلانا تھا۔ مگر پر شور ہنگاموں اور بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان تحریکوں کا کوئی حقیقی نتیجہ بر آمد نہیں ہو سکا۔ اب بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے۔ اکیسویں صدی شروع ہونے والی ہے۔ مگر بظاہر ہمارا کوئی روشن مستقبل دکھائی نہیں دیتا۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

غلام نبی شاہین
(سری نگر کشمیر)

جواب

یہ تحریکیں اگرچہ اسلام کے نام پر اٹھیں۔ مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ مثبت اسلامی فکر پر مبنی نہ تھیں بلکہ وہ تقریباً سب کی سب رد عمل کی تحریکیں تھیں۔ کوئی انگریز کے رد عمل میں، کوئی یہودی کے رد عمل میں، کوئی ہندو کے رد عمل میں، کوئی کسی مسلم حکمراں کے رد عمل میں، کوئی کسی اور رد عمل میں۔ رد عمل کی تحریک ہمیشہ ایک منفی تحریک ہوتی ہے اور قانون فطرت کے تحت کسی منفی تحریک سے کوئی مثبت نتیجہ بر آمد ہونا ممکن نہیں۔ منفی تحریک کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جہاں ہے وہیں بھڑک کر وہ اچھل کود شروع کردے۔ اس کے مقابلہ میں مثبت رد عمل یہ ہے کہ آدمی غیر جذباتی انداز میں سوچے اور پھر ایک منصوبہ کے تحت اپنا عمل وہاں سے شروع کرے جہاں سے باعتبار حقیقت اس کو اپنا سفر حیات شروع کرنا چاہئے۔ وقت گزرنے کے بعد اب امید کی صرف ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں دوبارہ کوئی حقیقی نوعیت کی مثبت تحریک اٹھے۔ مگر جہاں تک مسلمانوں کی موجودہ نسل کا تعلق ہے، وہ اس قسم کی کسی مثبت تحریک کی حامل نہیں بن سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی نئی تحریک کے لئے ہمیشہ نئی سوچ کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کی موجودہ نسل اس کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بیسویں

صدی کے مسلم رہنماؤں مثلاً سید جمال الدین افغانی، علامہ اقبال، سید قطب، سید ابوالاعلیٰ مودودی، آیت اللہ خمینی وغیرہ کے منفی افکار کے نتیجہ میں موجودہ مسلمانوں کی حالت تقریباً وہ ہو چکی ہے۔ جس کو قرآن میں قلوبنا غلف (البقرہ۸۸) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی دلوں کے اوپر غلاف چڑھ جانا۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے اندر جو لکھنے والے اور بولنے والے لوگ اٹھے، انھوں نے اسلام کی غیر حقیقی تشریح کی جس کو پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے اتنا زیادہ پھیلایا گیا کہ موجودہ مسلمانوں کی بیشتر نسل اس سے متاثر ہو کر رہ گئی۔ اب یہ نسل اسی فکری غلبہ (obsession) میں جی رہی ہے۔ اپنے اس بند ذہن سے باہر آکر سوچنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں اب جو امید ہے وہ مسلمانوں کی اگلی نسل سے ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے افکار کا تسلسل موجودہ نسل پر ٹوٹ جائے گا اور ہماری اگلی نسل ماضی کی اس فکر سے آزاد ہو کر سوچنے کے قابل ہو جائے گی۔ اس عمل کو فکری علیحدگی کا عمل (De-link-ing Process) کہا جاسکتا ہے۔ یہ عمل جب مکمل ہو گا تو اگلی مسلم نسل نئے ذہن کے تحت سوچنے کے قابل ہو جائے گی۔ بیسویں صدی کے رہنماؤں کے فکر سے آزاد ہو کر براہ راست قرآن وحدیث سے اپنا فکر اخذ کرنے والی یہی نسل اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مطلوب کام کرے گی۔ یہ عین وہی عمل (Process) ہے جو بنی اسرائیل کے ساتھ صحرائے سینا میں پیش آیا تھا۔ بنی اسرائیل کی مصری نسل جب صحرائے سینا میں ختم ہو گئی اور چالیس سال کے بعد اگلی نسل جوان ہوئی تو اسی نے اسرائیل کو از سر نو زندہ کیا۔ میرے نزدیک موجودہ مسلمان دنیا بھر میں اب اسی صحرائی دور کے آخری مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کا نصف اول انشاء اللہ وہ دور ہو گا جب کہ نئی مسلم نسل اٹھ کر کوئی بڑا اسلامی کارنامہ انجام دے گی۔

۱۔ راج گھاٹ (نئی دہلی) میں ۵ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کا انتظام اکھل بھارتیہ رچناتمک سماج کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع مذہبی ہم آہنگی تھا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر قرآن سے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور اس کی روشنی میں ایک تقریر کی جس میں اسلام کی تعلیمات کو بتایا گیا۔

۲۔ راما کرشنا مشن، نئی دہلی میں ۱۰ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک سمینار ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں انہوں نے کہا کہ ملک کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر پیار و محبت کے ساتھ رہنا سیکھیں۔ اتحاد کے بغیر ایک خاندان بھی ترقی نہیں کرتا، پھر پورا ملک کیسے اتحاد کے بغیر ترقی کر سکتا ہے۔ اتحاد کا راز ہے کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھنا۔ ناخوش گواری میں بھی خوشگوار پہلو کو نکال لینا۔

۳۔ ہندی روزنامہ نوجیوتی (اجمیر) کے نمائندہ مسٹر یوسف انصاری نے ۱۱ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق ہندستان کے موجودہ سیاسی حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ ہندستان کے لئے بظاہر اکیسویں صدی بھی ویسی ہی ہو گی جیسی کہ بیسویں صدی۔ اس لئے کہ یہاں کے حقیقی حالات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سب سے اہم چیز ایجوکیشن ہے مگر پچاس سال میں پہلی بار پروفیسر امرتیہ سین نے اس بات کو زور دار طریقہ سے کہا کہ ایجوکیشن کو دستور ہند کے بنیادی حقوق میں شامل کرنا چاہئے۔ یہ نہایت درست بات ہے۔ اگر ۱۹۴۷ ہی میں اس کو اختیار کر لیا گیا ہوتا تو آج ہم ایک نئے ہندستان کی تعمیر کر چکے ہوتے۔

۴۔ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا (نئی دہلی) کی نمائندہ ڈالی ودھوا نے ۱۳ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی

مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کنورزن کے مسئلہ سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ حالات میں کنورزن کے خلاف قانون بنانا ممکن نہیں۔ ایسا قانون دستور ہند اور خود ہندو مذہب کی نفی کے ہم معنی ہوگا۔ اسی کے ساتھ ہندستان نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کیا ہے جس میں ہر ایک کو مکمل آزادی کا حق دیا گیا ہے۔ ہندستان جب تک اس عہد سے بندھا ہوا ہے وہ اینٹی کنورزن قانون نہیں بنا سکتا۔ اینٹی کنورزن منصوبہ سادہ طور پر صرف کنورزن کے خلاف نہیں بلکہ وہ نیچر کے خلاف ہے اور کون ہے جو نیچر کے خلاف پابندی لگانے میں کامیاب ہو۔

۵۔ نیشنل کونسل فار فلاسفیکل ریسرچ، نئی دہلی کے تحت تغلق آباد میں ۱۴ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک سمینار ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس میں مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ صدر اسلامی مرکز نے یہاں اسلام اینڈ پیس کے موضوع پر انگریزی میں ایک تقریر کی۔

۶۔ اسٹار ٹی وی کی ٹیم نے ۱۵ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویور مسٹر راکیش ترپاٹھی تھے۔ ایک سوال سیاسی روزہ افطار کے بارہ میں تھا۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ دنیا مقابلہ کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنا فائدہ لینا چاہتا ہے۔ آپ لوگوں کی نیت کو نہ دیکھئے ۔بلکہ یہ دیکھئے کہ جو لوگ افطار کے نام سے وہاں اکٹھا ہوتے ہیں وہ کہیں اور نہیں ملیں گے۔ لہٰذا اس موقع کو آپ روزہ کے تعارف کا اسٹیج بنا دیجئے۔ میں نے خود ایسا کئی بار کیا ہے۔

۷۔ زی ٹی وی کی ٹیم نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ آج کل پولیٹکل لوگ افطار کا انتظام کرتے ہیں۔ یہ کھلے طور پر سیاسی افطار ہے۔ کیا اس سے روزہ اور افطار کا تقدس مجروح نہیں ہوتا۔ میں نے کہا کہ اس موقع کو آپ روزہ اور اسلام کے تعارف کا ذریعہ بنائیں۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کریں۔ لوگوں کو اسلام کی باتیں بتائیں۔ اسلام کے تعارف پر خوبصورت پمفلٹ چھاپ کر تقسیم

کریں۔

۸۔ صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۹ کو نشر کی گئی۔ اس کا موضوع عید الفطر تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ عید الفطر کا تیوہار عالمی انسانی قدروں کو فروغ دینے کا تیوہار ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر زندگی گزارنے کی تربیت دی جائے۔

۹۔ آریہ سماج بھون (نئی دہلی) میں ۲۴ جنوری ۱۹۹۹ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع سوشل جسٹس تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر اسلام کی روشنی میں تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام میں دو بنیادی تصور ہے۔ جس پر اسلام کی تمام تعلیمات مبنی ہیں۔ توحید اور عدل۔ اس کو قرآنی آیتوں کی روشنی میں واضح کیا۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اسلام کے مطابق آدمی کو چاہئے کہ سماج میں جہاں بے انصافی ہو وہاں پہنچ کر اس کو روکنے کی کوشش کرے۔ ایسا نہ کر سکے تو کھلے طور پر اپنی زبان سے اس کی مذمت کرے۔ یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے اس کو غلط سمجھے۔

۱۰۔ ۲۶ جنوری ۱۹۹۹ کو این ٹی وی (نئی دہلی) نے ایک گروپ انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کے علاوہ سوامی اگنی ویش، فادر والسن تھمپو، ڈاکٹر موہندر سنگھ، ڈاکٹر مرچنٹ بھی شریک تھے۔ سوالات کا تعلق ملک میں امن وامان کے سوال سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں صدر اسلامی مرکز نے کہا کہ کسی بھی سماج میں اختلافات کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس لئے خود اختلاف کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اختلاف کے موقع پر ہمیشہ ڈائیلاگ اور پرامن حل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کسی بھی حال میں تشدد اور توڑ پھوڑ کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

۱۱۔ اسلام پور (مرشد آباد) کے دینی مدرسہ کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے مرشد آباد

(بنگال) کا دورہ کیا۔ یہاں مدرسہ کے سالانہ اجتماع میں شرکت کی۔ اور مختلف مقامات پر کئی دینی اور دعوتی خطابات کئے۔ یہ سفر ۳۰ جنوری ۱۹۹۹ کو شروع ہوا اور ۲ فروری کو ختم ہوا۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفرنامہ کے ذیل میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲۔ نیشنل کونسل آف چرچ (نئی دہلی) کی طرف سے وائی ایم سی اے کا نفرنس سنٹر میں ۵ فروری ۱۹۹۹ کو ایک انٹر نیشنل میٹنگ ہوئی۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ یورپ کے کئی اسکالر شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تھا: انسان کو باہم جوڑنے والی چیز کیا ہے۔ صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی اور حدیث کی روشنی میں انگریزی میں ایک تقریر کی۔

۱۳۔ گلف نیوز کے نمائندہ مسٹر گوپال مشرا نے ۶ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ اسلام میں ہر فرد کو رائے کی آزادی دی گئی ہے۔ اسلام کے مطابق کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے کہے کہ تم فلاں بات بولو اور فلاں بات نہ بولو۔ ایک آدمی کو اگر کسی کی رائے سے اختلاف ہے تو وہ دلیل کے ذریعہ اس کی کاٹ کر سکتا ہے، لیکن اختلاف رائے کی بنیاد پر کسی کے خلاف تشدد کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

۱۴۔ ادارۂ الرسالہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ وہ اسلام کے پیغام توحید اور پیغام انسانیت کو نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا میں پھیلائے۔ اس کا ایک نمونہ وہ مضمون ہے جو حال میں انگریزی اخبار پانیر (۷ فروری ۱۹۹۹) میں چھپا ہے۔ یہ مضمون مع ترجمہ الرسالہ کے زیر نظر شمارے میں شامل ہے۔ پانیر میں یہ مضمون مندرجہ ذیل عنوان سے شائع ہوا:

How Islam passed the test of history

اس طرح کے مضامین انگریزی اور ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل میں سالہا سال سے مسلسل شائع کئے جا رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ ملک کے اندر اور ملک کے باہر

مشترک کانفرنسوں میں سال بھر یہ دعوتی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسلام کی دعوت کو پھیلانا اور اسلام کی عظمت کو آج کی دنیا میں قائم کرنا الرسالہ کا نشانہ ہے۔ اور غالباً الرسالہ مشن دور جدید کا واحد مشن ہے جو کامیابی کے ساتھ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر یہ کام کر رہا ہے۔ امریکہ کے کچھ لوگوں کے تعاون سے یہ مشن اب انٹرنیٹ اور ویب سائٹ پر بھی آچکا ہے۔

۱۵۔ فروری ۱۹۹۹ کے پہلے ہفتہ میں صدر اسلامی مرکز نے بنگال کا دعوتی سفر کیا۔ اس سلسلہ میں کلکتہ، برہم پور اور مرشد آباد میں مختلف پروگرام ہوئے جن میں اس علاقہ کے ہندو اور مسلمان دونوں بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ بڑے پیمانہ پر انفرادی ملاقاتیں ہوئیں۔ گفتگو اور تقریر کا موضوع زیادہ تر دو تھا۔ اسلامی دعوت اور ملکی تعمیر۔ اس چار روزہ سفر کی روداد انشاءاللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۶۔ کھادی اینڈ ولج انڈسٹریز کمیشن کی طرف سے ۹ فروری ۱۹۹۹ کو انڈیا انٹر نیشنل سنٹر میں ایک سیمنار ہوا جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع تشدد اور پولیوشن تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس موضوع پر ایک تقریر کی۔ ایک مقرر کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندستان میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ اسلام جہاں بھی پھیلا ہے اپنی نظریاتی برتری کے زور پر پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور پر۔

۱۷۔ دوردرشن (نئی دہلی) نے ۱۹ فروری ۱۹۹۹ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک گھنٹہ کے انٹرویو میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ کو سنگیت سننے کا شوق ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ سنگیت سے دلچسپی تو انسان کی فطرت ہے۔ مگر مجھے پروفیشنل آرٹسٹوں کے سنگیت سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس فطرت کا سنگیت مجھے بہت پسند آتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے، ہواؤں کی سرسراہٹ، دریا کی روانی میں جو موسیقی ہوتی ہے وہ فطرت کی موسیقی ہے، وہ بناوٹی نہیں، ایسی فطری موسیقی مجھے پسند آتی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

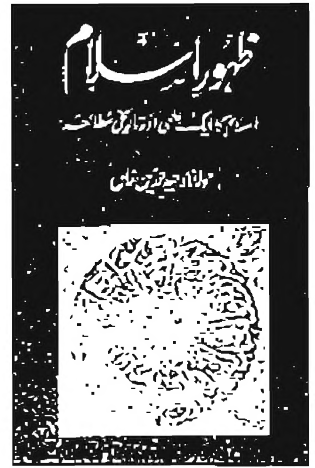
۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

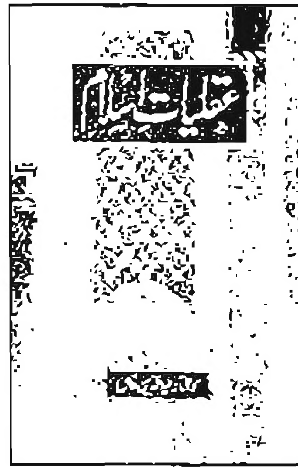
۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

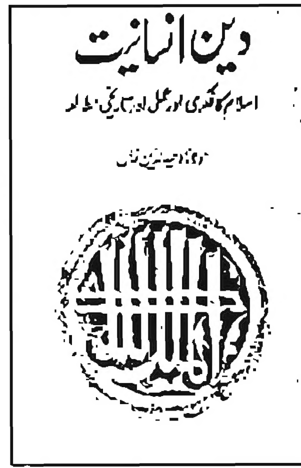
۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینہ) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

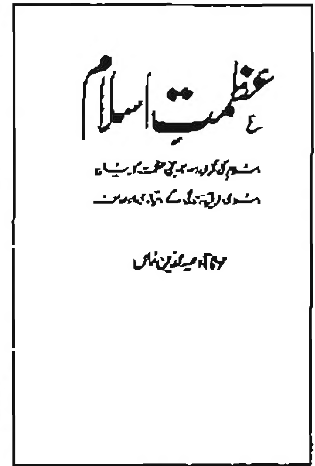
	INLAND		ABROAD	
	Urdu	English	Air-Mail	
	Rs.	Rs.	US$	£
1 Year	100	60	10	6
2 Years	195	120	20	12
3 Years	290	175	30	18
5 Years	480	280	50	30

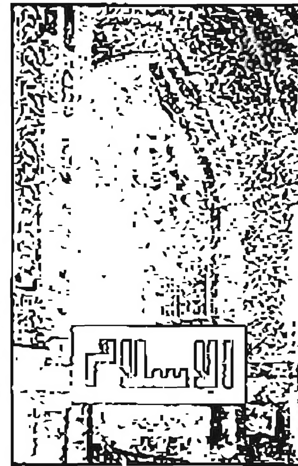

ظہورِ اسلام


عقلیاتِ اسلام

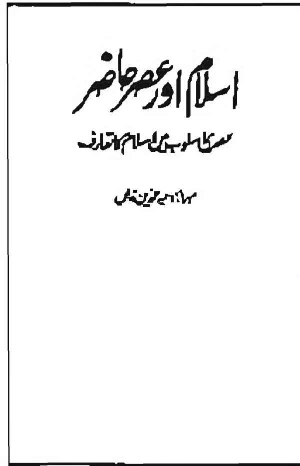

دین انسانیت


مذہب اور جدید چیلنج

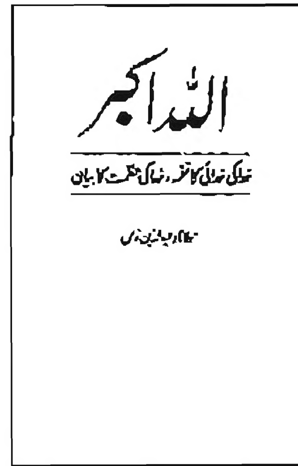

عظمتِ اسلام

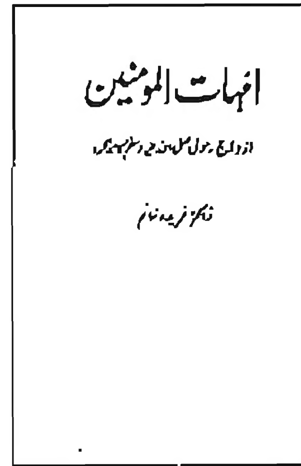

الاسلام

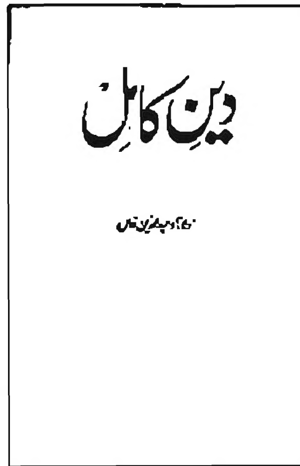



اسلام اور عصرِ حاضر


قیادت نامہ


اللہ اکبر


امہات المومنین


دینِ کامل


تجدیدِ دین


خاتونِ اسلام




اسلامی زندگی



ISLAMIC BOOKS



Books by Maulana Wahiduddin Khan

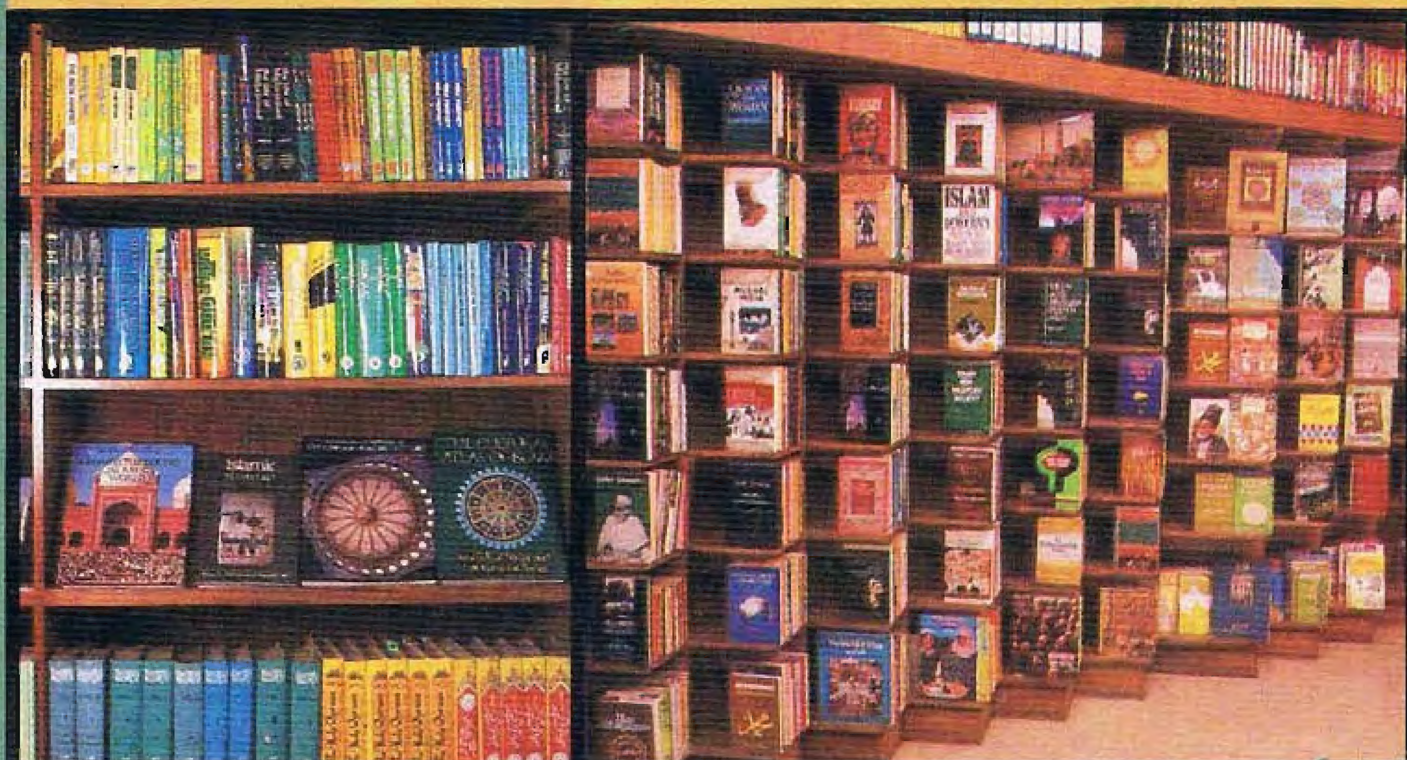
Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
Islam and Modern Challenges	95.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	95.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	55.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder (Forthcoming)	—

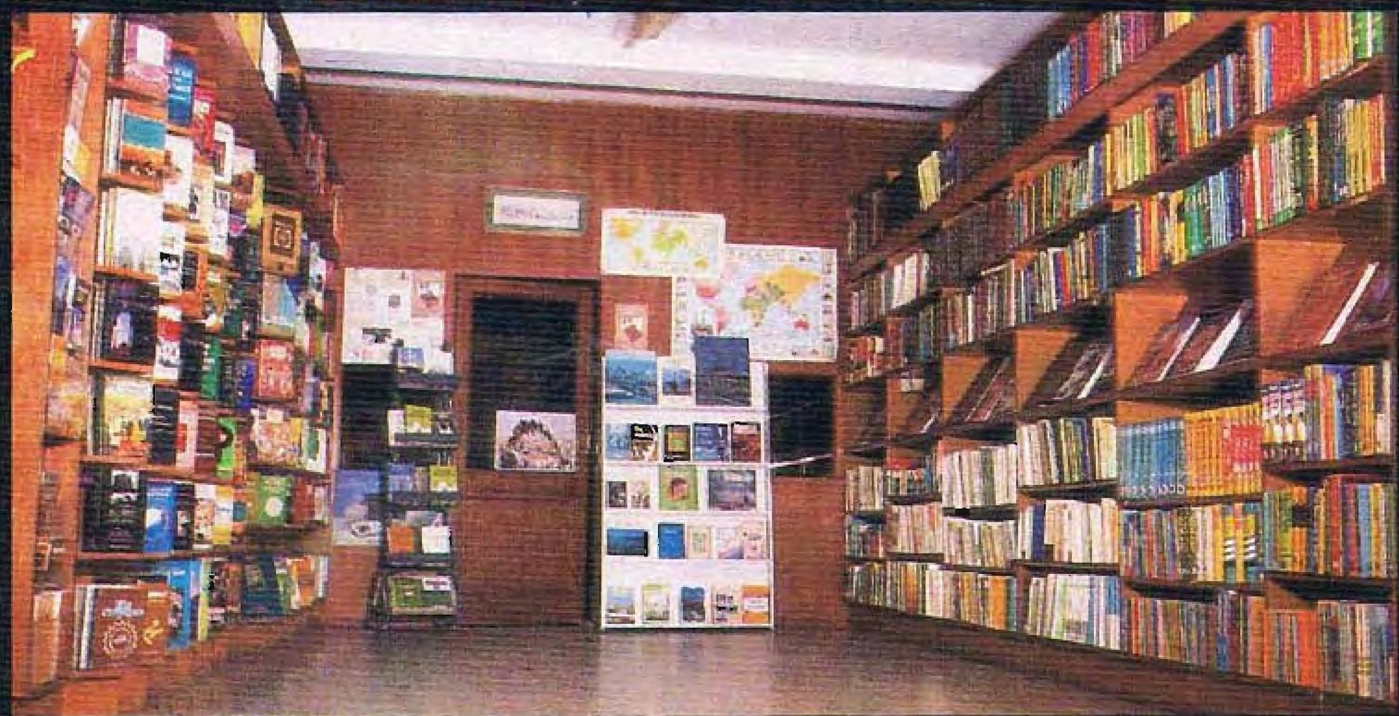
The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	95.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
The Story of Hajj (Forthcoming) by Saniyasnain Khan	—
History of the Prophet Muhammad by Philip K. Hitti	75.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam: Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muslim Travel Guide (Forthcoming) Ruqaiyyah Waris Maqsood	—
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

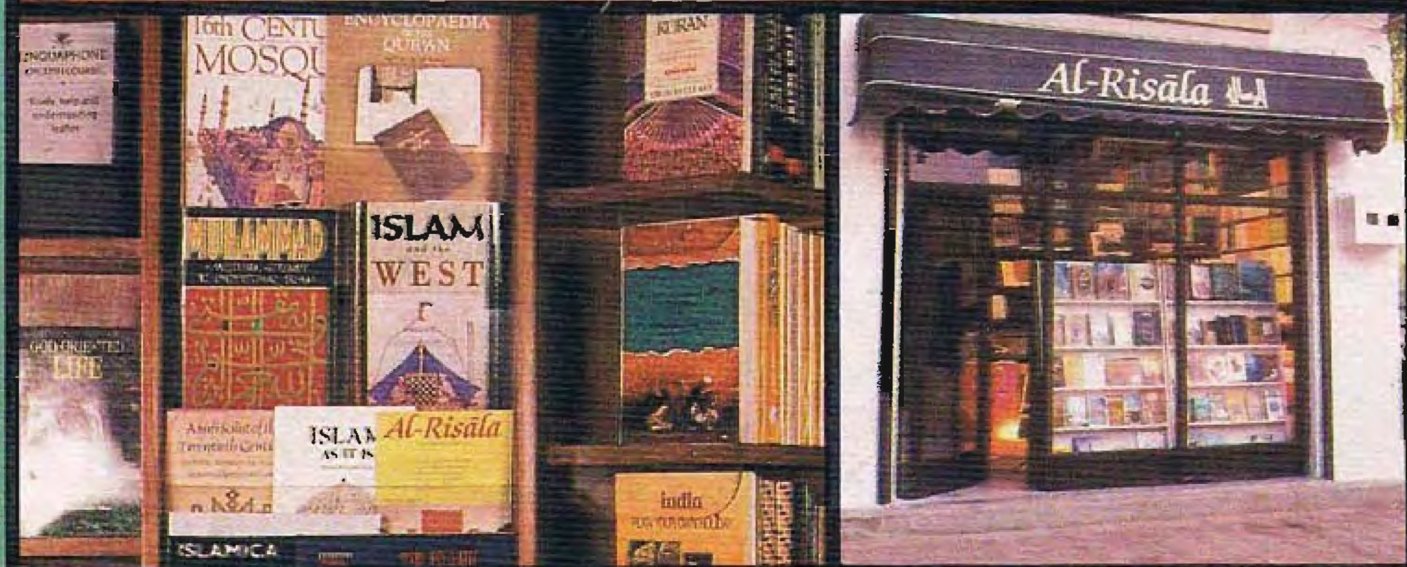
Al-Risāla

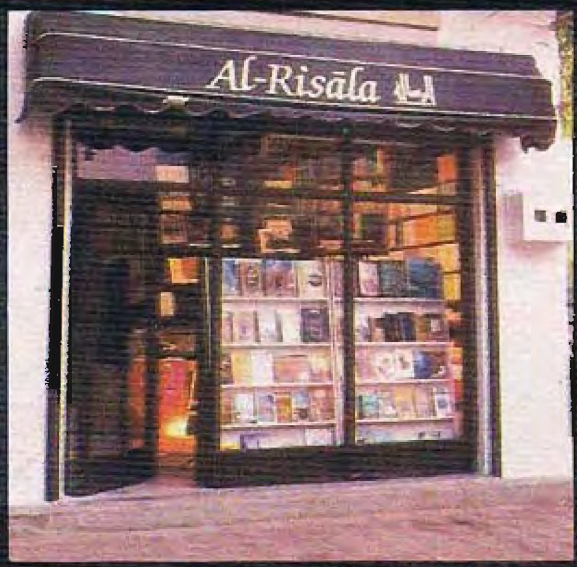
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. 4625454, 4611128 • Fax 9111-4697333
e-mail: skhan @ndf.vsnl.net.in • http://www.alrisala.org

Finest collection of books on Islam









AL-RISALA BOOK CENTRE

1, Nizamuddin West Market, Near DESU, New Delhi-110 013

Tel. 4611128 Fax 4697333